علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم

# طلوعِ اسلام

جون ۱۹۳۸ء
جلد ۱ شمارہ ۲

June 1938

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکز ملت ← لا الٰہ الا اللہ / محمد الرسول اللہ → مرکز ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

# مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایہا الذین آمنوا

| | |
|---|---|
| اعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا | استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم |
| اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو | بات مانو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائیں جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو |

یعنے

## مرکز۔ مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

| | |
|---|---|
| جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا | جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں |
| علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار | لا اسلام الا بالجماعۃ |
| (فرمان رسول) | (قول حضرت عمر) |

(اقبال)

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ — باہزاراں چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

# طلوعِ اسلام کا

**مسلک**۔ جیسا کہ پہلے پرچہ میں بالوضاحت بتایا جاچکا ہے طلوعِ اسلام کا مقصد حضرت علامہ اقبالؒ کے پیامِ حیات بخش کی اشاعت ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق ہر مسئلہ کا حل قرآنِ کریم کی روشنی میں پیش کیا جائے مفکرینِ عالم کے سامنے اس حقیقتِ کبریٰ کو بے نقاب کیا جائے کہ عالمگیر امن و فلاح کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دنیا کا نظامِ زندگی وہ ہو جو خدا کے اس آخری ضابطۂ حیات میں مرتب کر کے دیا گیا ہے۔ اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں یہ یقین راسخ کیا جائے کہ دنیا علم و بصیرت کی جن بلندیوں تک جا ہے پہنچ جائے۔ قرآن کریم اس سے بھی کہیں آگے نظر آئیگا۔

**نظام**۔ طلوعِ اسلام کے نظام کے متعلق بھی اعلان کیا جاچکا ہے کہ یہ پرچہ کسی فرد کی ملکیت نہیں بلکہ تمام ملتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے۔ اس کا نظم و نسق ایک ایسی جماعت سے متعلق ہے جس کے ارکین نے محض اللہ کے لئے اس فریضہ کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس پرچہ کے خسارہ کو پورا کرتے جائینگے لیکن اسکے منافع میں سے کوئی شخص ایک پائی بھی اپنے لئے جائز نہیں سمجھیگا گذشتہ سال بعض مخلص احباب نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ طلوعِ اسلام کو پائدار بنیادوں پر قائم کرنے کیلئے ایسے ایثار پیشہ معاونین پیدا کئے جائیں جو صرف ۲۵ یکمشت ادا کر کے اس کی سرپرستی فرماتے رہیں اور رسالہ کو مستقبل کے خطرات سے نجات دلا دیں۔ دائرہ طلوعِ اسلام نے اس مقدس تحریک کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ تجویز کیا ہے کہ اس طرح جب تین ہزار روپیہ جمع ہوجائے تو اس کو محفوظ سرمایہ قرار دیکر اطمینان کے ساتھ رسالہ کی ترقی کے وسائل اختیار کئے جائیں تاکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوسکے۔۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں اب تک تیرہ سو روپے کے وعدے ہوچکے ہیں جن میں سے چھ سو روپیہ وصول بھی ہوچکا ہے۔ انشاءاللہ دائرہ طلوعِ اسلام کی کوششیں برابر جاری رہینگی یہاں تک کہ تین ہزار کا محفوظ سرمایہ جمع ہوجائے۔ لہذا

## جو حضرات

اس جماعت کی رکنیت پسند فرمائیں وہ پچیس ۲۵ روپیہ یکمشت یا بالاقساط ادا فرما کر ان خدمتگذاروں کے حلقہ میں شامل ہوجائیں رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم (دائرہ طلوعِ اسلام دہلی)

# سَرُودِ رفتہ

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے اپنی وفات سے دس منٹ پہلے حسب ذیل قطعہ پڑھ کر اپنے سفرِ آخرت کی اطلاع فرما دی

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

# طلوع اسلام دہلی

(دورِ جدید)

مدیر مسؤل حکیم ذکی احمد خاں — بدل اشتراک — فی پرچہ

معاون محمد عثمان — پانچ روپیہ سالانہ — ۸ر

جلد — شمارہ — بابت ماہ جون ۱۹۳۸ء

## فہرست مضامین


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | سرودِ رفتہ | علامہ اقبال کی آخری رباعی | ۳ |
| ۲ | لمعات | مدیر | ۵ - ۱۱ |
| ۳ | اصولِ قرآن | مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری | ۱۲ - ۲۰ |
| ۴ | مرثیۂ اقبال | جناب اسد صاحب ملتانی | ۲۱ - ۲۶ |
| ۵ | سوراجی اسلام | جناب "رازی" | ۲۷ - ۵۱ |
| ۶ | حیات | جناب بشیر الدین صاحب بی اے | ۵۲ - ۶۱ |
| ۷ | حقائق | "ادارہ" | ۶۲ - ۶۴ |
| ۸ | بصائر | "دیوور" | ۶۵ - ۶۷ |
| ۹ | تکلف برطرف | رازی | ۶۸ - ۷۲ |
| ۱۰ | رفتارِ زمانہ | ادارہ | ۷۳ - ۷۹ |
| ۱۱ | کانگرس مسلم لیگ اور مسلمان | جناب عبداللہ جان صاحب شملہ | ۷۹ - ۸۰ |
| ۱۲ | معارف القرآن | جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز بی اے | |

# لمعات

کیا خبر تھی کہ "طلوعِ اسلام" جس اسلامی مفکر کے فلسفۂ حیات کا صور پھونکنے اور مسلمانوں کو صحیح اسلام سے روشناس کرانے کے لیئے میدان میں نکلنے والا ہے، وہ علم وعرفان کی دُنیا کو یتیم اور غمزدہ چھوڑ کر خدائے کون و مکاں کی لقا کے لیئے بے تاب بیٹھا ہے اور مادی قبا کو تنِ نورانی سے اُتار پھینکنے پر تُلا ہوا ہے! سچ یہ ہے کہ علامہ محمد اقبال مرحوم و مغفور کو فان اجل اللّٰہ کا مت کی ئے اتنی پیاری لگی کہ پیاسی دُنیا کو سیراب کرنے کا خیال ہی نہ رہا اور شیفتگی اور وارفتگی کے عالم میں اتنے تیز قدم اُٹھائے کہ علم و فکر کی آبادی اس نقیبِ زندگی کو دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی مرحوم کو خیال ہی نہ رہا کہ فطرت کی نجشائشیں کن اُمور کی منتظر ہیں، اور علم و حکمت کو ابھی اُنکی کس قدر ضرورت ہے۔ حقیقت میں یہ عاشقِ رسول، یہ حکیمِ اسلام۔ یہ علم و معرفت کا بحرِ قلزم اور اسلام کا یہ بے مثال فلسفی من کان یرجو القاء اللّٰہ فان اجل اللّٰہ لآت کی صبر شکن صدا کو سُنکر کب تک صبر کرتا؟ اُسنے غیب سے یہ صدا سُنی، لبیک کہا! و علم و حکمت کو روتا ہوا اور خود مُسکراتا ہوا اپنے محبوب کے پاس چلدیا!

---

مرحوم نے اپنے غریب خانہ پر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو ۵½ بجے انتقال فرمایا اور جس خوف سے ساری عمر مسلمانوں کو بے خوف کرتے رہے اُس سے یہ کہکر۔

"میں مسلمان ہوں اس لیئے خوشی سے موت کا استقبال کرتا ہوں"

بغلگیر ہوگئے! اور اپنے آخری وقت میں بھی دُنیا کو اسلام کی تفسیر بتا دی!

آپ کی وفات سے نہ صرف مشرق کی تابندہ و پایندہ شاعری کو نقصان پہونچا ہے۔ نہ صرف علم و حکمت کی دُنیا یتیم ہوگئی ہے نہ صرف اجتماعی زندگی کی شمع گل ہوئی ہے بلکہ انسانی ضمیر کا

وہ احساس گم ہوگیا ہے جو وحدۃ انسانی کی بنیاد رجائیت وعمل کی اساس اور فکر حیات کا سرچشمہ تھا، مرحوم ومغفور اقبال نہیں نہیں عزائم وخودداری کے پیکر نورانی، اردو شاعری کے باعث ہندوستان میں اور فارسی کلام کے باعث دنیا کے گوشہ گوشہ میں متعارف ہیں، اور ہر شخص انکے خیالات ونظریات سے انکے کمالات علمی کا اندازہ لگا سکتا ہے اور گو انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ لاہور میں گزارا اور ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی کہلائے مگر حقیقت میں وہ کسی ایک ملک، کسی ایک قوم اور کسی ایک دور کی شخصیت اور ملکیت نہ تھے بلکہ وہ دور حاضرہ کی انسانیت کے امانت تھے وہ حکیم تھے ان کی تشخیص درست ہوتی اور بیماری کے اسباب کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور انھوں نے انسان کی مصیبتوں کا جو علاج تجویز کیا تھا اس کی بنیاد بھی انسانیت اور ضمیر کی آواز تھی +

---

اقبال کا خزانہ علم وحکمت عام ہے۔ دنیا تیس سال سے انکے موتیوں سے اپنے دامن بھرتی رہی ہے اور خدا جانے کتنی سعید روحیں ہیں، جنھوں نے اقبال کے پیام کو سنا اور انکے نظریات علم کے اس سانچہ میں ڈھل گئے جس سے بہتر فطرت نے کوئی دوسرا سانچہ تیار نہیں کیا ہے گو شاعری کا اعلیٰ سے اعلیٰ تصور اور بہتر سے بہتر تخیل بھی مرحوم کے مخصوص علم کلام کا آئینہ دار نہیں ہوسکتا تاہم انکی بے مثال شاعری نے جس طرح اسلامی ضمیر کی تشکیل کی ہے اور موجودہ مذہبی اور سیاسی، حول میں اسلام کے فلسفہ کو جس بلندی پر پہونچایا ہے اس کی مثال موجودہ صدی میں ملنی محال ہے۔

اقبال، ہمیشہ مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں کے حقوق کے علمبردار رہے۔ انکا ایمان تھا کہ جب تک مسلمان دور اول کی زندگی کو اختیار نہیں کریںگے اور کتاب وسنت کو اپنے عمل وفکر کی بنیاد قرار نہیں دینگے۔ اسوقت تک انکو نہ مغرب پرستی تباہی سے بچا سکتی ہے اور نہ یورپ، زندگی انکے درد کی دوا ہوسکتی ہے، چنانچہ وہ ساری عمر اسی فلسفۂ حیات کا درس دیتے رہے اور یہی سرچشمہ ان کو مسلم کی زندگی میں نظر آتا رہا۔ اسی لیے وہ مسلم بنکر جیے، مسلم بن کر میدان میں آئے اور مسلم بن کر

واصل بحق ہوئے اُنکے نزدیک زندگی کا راز، فلسفۂ حیات کا نکتہ، اور عظمت و کامرانی کا جوہر کتاب الٰہی کے صرف اُس ٹکڑہ میں پوشیدہ تھا

ربّ توفنی مسلماً والحقنی بالصّالحین

اے پروردگار! مجھے مسلم بنا کر اُٹھا اور صالحین کی معیت نصیب کر!

---

مرحوم کا دائرہ خدمت سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ انھوں نے دُنیا کو اجتماعی زندگی کا درس عمل دیا۔ رجائیت اور خودداری پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی، زندگی کے جذبات میں تلاطم پیدا کیا، دماغوں کو رفعت اور بلندی بخشی، قوم کی ذہنیت اور مزاج میں ایسا انقلاب پیدا کیا جو آئندہ ایک عرصہ تک ہر اصلاحی تحریک میں بنیادی عنصر کا کام دیتا رہے گا،

اقبال کا عقیدہ تھا، اور کون اسلام کا عارف اور حکیم ہے جو اس کا قائل نہ ہو کہ اسلام میں اتنی وسعت، اتنی ہمہ گیری اور اتنی صلاحیت موجود ہے کہ جو قوم اپنے نظامِ حیات کو قرآن حکیم کے سپرد کر دے گی قرآن زندگی کے قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرے گا اور قوم کا مزاج عقلی اس سے تقویم پاتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم زندگی کے کسی نظام سے مطمئن نہ تھے اور دنیا کی کوئی غلط تحریک اُنکے دماغ کو متاثر نہ کر سکی۔ اُنکے نزدیک زندگی کا مکمل نظام اور ضابطۂ حیات صرف اسلام ہے اور بلاشبہ جو شخص بھی مرحوم کی سی گہری نظر رکھے گا وہ ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔

---

مثل مشہور ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی قدر ہوتی ہے مگر مرحوم اس کُلیہ سے مستثنیٰ ہیں آپ کو اپنی زندگی میں رفعت و عظمت کا وہ بلند مقام حاصل ہوا جو صرف آپ ہی کے لئے مقدر تھا آپکا کلام نہ صرف انگریزی میں بلکہ یورپ کی دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا اور اس سے مغرب کے دانش فروشوں نے انسانیت، عزم، خودداری اور رجائیت کے سبق سیکھے۔ اگرچہ مغرب کو معلوم تھا کہ

اقبال مغرب کے مادی رجحانات کے سخت مخالف ہیں اور وہ اسلام کے عملی نظریہ کے مطابق روحانیت اور مادیت کا صحیح امتزاج چاہتے ہیں تاہم اُنکے فلسفہ حیات کی تشریح نے مغربی مفکرین کے فکر و نظر کو جلا بخشی اور اُنکو کلام اقبال کے صدقہ میں زندگی کا راز معلوم ہوا ۔

اقبال کبھی اپنی زندگی میں کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، پان اسلامزم کے خلاف فرانس کا پروپیگنڈہ آپ کے اسلامی جسم میں وحدۃ اسلامی کی نئی اور تازہ روح پھونک دیتا ہے وطنیت اور قومیت کا وہ فرنگی تصور جسنے اسلامی ممالک کے بڑے بڑے اسلامی مفکرین تک کو اپنے چنگل میں پھنسالیا ہے وہ اس سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوئے بلکہ ساری عمر ان بتوں کو توڑنے میں گزاری یہاں تک کہ پیر و مسلم یورپ کا سفر کرتا ہے اور وہاں سے اسلامی حرارت لے کر واپس ہوتا ہے، حالانکہ یورپ ہی وہ مقام ہے جہاں جاکر بڑے سے بڑے متقی کا قلب و دماغ کمزور ہو جایا کرتا ہے، مگر اقبال اس امتحان میں بھی ثابت قدم رہتا ہے اور یورپ کے طواف سے اس کا اسلامی دماغ اور پختہ ہو جاتا ہے ۔

---

غرض علامہ اقبال مرحوم و مغفور اقوام مشرق کے لیئے اپنے کلام میں فکر و حیات کی وہ آگ سلگتی چھوڑ گئے ہیں جس سے قومیں زندگی اور قوت کی حرارت حاصل کرتی رہیں گی کیونکہ وہ ایک معلم و مفکر ہی نہ تھے، بلکہ انسانی ضمیر کے محرک بھی تھے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب تک علم و حکمت باقی رہے گا جب تک انسانیت کے احترام کا جذبہ سینوں سے اُبلتا رہے گا جب تک ملوکیت اور حکمرانی کی اصلاحی تحریکیں جاری رہیں گی اسوقت تک اس حکیم اسلام اور مصلح عالم کی یاد بھی تازہ رہے گی !

بقول اخبار "ہمنشین" اقبال کے فقدان سے ہم فقیر ہو گئے ہیں، مگر انکے زندہ کلام نے ہم کو اس قدر غنی کر دیا ہے کہ ہم ہمیشہ دارائی اور سکندری کرتے رہینگے ۔

اے خدا مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازئے اور اپنے بندوں کے اس محبوب بندہ کو اپنی محبوبیت

اور مغفرت کی چادر میں ڈھانک لے اور جملہ متعلقین کے قلب حزین پر صبر جمیل کا القا فرما آمین ؎

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(اقبال ؒ)

مئی کا طلوع اسلام انتظامی سہولتوں کے خیال سے اپریل کے وسط میں ہی شایع ہو چکا تھا کچھ پرچے باہر جا چکے تھے اور کچھ باقی تھے کہ مرحوم کے انتقال کی خبر پہنچی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس خبر سے قلوب پر کیا گزری اور کیا کیا خیالات پیدا ہوئے۔ مگر دل کو تھام کر "نالۂ یتیم" کے عنوان سے مرحوم کے انتقال کی خبر علیحدہ چھپوائی گئی اور مئی کے جو پرچے دفتر میں موجود تھے اُنکے ساتھ لگا دی گئی +

اس سلسلہ میں بعض احباب کا خیال تھا کہ طلوع اسلام کا آئندہ پرچہ دلیعنے جون کا موجودہ پرچہ) اقبال نمبر ہونا چاہیے مگر چونکہ طلوع اسلام آپ ہی کی یادگار ہے اسلئے اسکا ہر پرچہ گویا اقبال نمبر ہے اور اسوقت کسی خاص نمبر کی ضرورت نہیں ہے گو حضرت علامہ ؒ کے متعلق ساری عمر لکھا جائیگا مگر پورے انتظام کے ساتھ جو خاص نمبر نکالیں گے وہ انشاء اللہ اقبال نمبر ہی ہوگا۔

اگر مسلمانوں نے علامہ ؒ کی مستقل اور پائدار یادگار قایم کرنے میں عجلت نہ کی، اور اُن کی شایان شان کوئی نشانی آیندہ نسلوں کے لیے نہ چھوڑی تو طلوع اسلام کے اقبال نمبر سے کچھ نہ بنے گا اور یہ مسلمانوں کی نہیں علم و حکمت کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوگی اگر اسلام کے اس حکیم یگانہ کی کوئی یادگار قایم نہ ہوئی +

اقبال ؒ کی یادگار کے سلسلہ میں...... جو کمیٹی لاہور میں قایم کی گئی ہے اس میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو، سکھ، عیسائی، انگریز سب ہی شامل ہیں جس سے مرحوم کی مقبولیت اور محبوبیت

کا پتہ چلتا ہے۔ اس کام کا آغاز پنجاب سے ہونا چاہیئے اگر صوبہ کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں اور پنجاب کے دیگر علم دوست اس کام کو انجام تک پہنچانے کا تہیّہ کرلیں تو یقیناً ہندوستان میں مرحوم کی ایک بے مثل یادگار قایم ہو سکتی ہے ہم انشاءاللہ اس سلسلہ میں آئندہ مفصل گفتگو کریں گے

---

ذرا تصور میں لایئے اس کیفیت کو کہ آپ کسی بیابان صحرا میں راہ گم کردہ کھڑے ہوں منزل کا کہیں نشان نہ ملے چاروں طرف کوسوں تک کسی ذی روح کا پتہ نہ چلے۔ شام کا سناٹا آنیوالی شب تیرہ و تار کی بھیانک سیاہی کو دامن صحرا پر پھیلا رہا ہو۔ واہمہ کے عفریت چھلاوے ہر طرف سے ڈرا رہے ہوں ایسے میں کہیں دُور سے کسی انسان کی ایک مبہم سی آواز آپکے کانوں میں آپہونچے۔ جو کیفیت آپ کے قلب کی اسوقت ہوگی کچھ اسی قسم کی اضطرابی کیفیت کے آئینہ دار وہ خطوط اور پیغامات ہیں جو ہمیں قارئین کرام کیطرف سے طلوع اسلام کے پہلے ہی پرچے کے مطالعہ کے بعد موصول ہوئے ہیں کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا یہ راہ گم کردہ۔ مایوس قافلہ ہر اُس آواز کے لئے ہمہ تن گوش ہونے کے لئے بیتاب ہے جس میں کچھ بھی اُمید کی جھلک نظر آئے۔ یہ علامات بڑی جرأت افزا ہیں۔ اس سے پیشتر تو یہ حالت تھی کہ متاع کارواں لٹ جانے کے بعد۔ کارواں کے دل سے احساس زیاں بھی جاتا رہا تھا لیکن اب اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ احساسِ زیاں پھر سے پیدا ہو رہا ہے اور یہی احساس ہے جو ایک قوم کے اجزائے پریشاں کو ایک مرکز پر لانے کا اوّلیں ذریعہ ہوتا ہے اس اضطرابی کیفیت کا اس سے اندازہ فرمایئے کہ کسی نے پوچھا ہے کہ صاحب! سب باتوں کو چھوڑیئے اور یہ بتایئے کہ ہمارے لیئے راہِ عمل کونسی ہے! کسی نے دریافت کیا ہے کہ یہ کہیئے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ایک اتنی بڑی غیر مسلم اکثریت میں گھری ہوئی ہے مسلمانوں کا طرزِ عمل دوسروں کے ساتھ کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ کسی نے سوال کیا ہے کہ اگر غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا تولّی جایز نہیں تو پھر باہمی تعاون و اتحاد کی کونسی شکل ہے۔ کسی کا استفسار ہے کہ جب دینِ فطرت یوں بھی افسانوں کی وجہ سے ایک چیستاں بن چکا ہے تو حقیقی اسلام کا اب کیسے پتہ چلے گا

غرضیکہ اسی قسم کے گوناگوں سوالات ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قوم کے دل میں صحیح راستہ کی تلاش کے لیے کتنی بڑی تڑپ اور خلش موجود ہے۔ ہمیں ان مستفسرین حضرات کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے لیکن ہم گزارش کرینگے کہ وہ اپنے وفورِ شوق کو تھوڑی سی زحمتِ انتظار اور دیں۔ طلوعِ اسلام کا نصب العین ان تمام سوالات کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔ آپ اگر اسے شرفِ نظر بخشتے رہے تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ محسوس کرینگے کہ آپکے وہ تمام شکوک و شبہات جو آپکے دل کی گہرائیوں سے ابھرتے رہتے ہیں۔ خود بخود رفع ہوتے جائینگے اور آپکا یہ تمام اضطراب و تردد جو آپکے سینے میں آتش خاموش کی طرح سلگ رہا ہے مبدل بہ سکون و طمانیت ہو جائیگا۔ بعونہٖ تعالیٰ سب کچھ ہوگا لیکن آہستہ آہستہ، کہ کانٹوں میں اُلجھے ہوئے دامن کو جھٹکا کے چھڑانا دانش مندی نہیں ہوتی۔

---

موجودہ اشاعت میں کتاب "معارف القرآن" کا دیباچہ شائع ہو رہا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب کیا ہے۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کے ذریعہ مسلمان حقائق قرآن تک کس طرح رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور نتائج کے لحاظ سے کتاب کی قدر و قیمت کیا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا اعلان مئی کے طلوعِ اسلام میں کیا گیا تھا اور جو اس رسالہ میں مسلسل شائع ہوتی رہے گی۔ کتاب معارف القرآن رسالہ کے آخری جزو سے شروع ہوگی، اور اس کے صفحات مسلسل اور علیحدہ ہوں گے تاکہ قارئین کرام ہر ماہ اس جزو کو علیحدہ کر کے کتاب کی شکل میں لے آئیں اور ان کو رسالہ کے ساتھ ایک مستقل کتاب مل جائے۔

معارف القرآن کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا دیباچہ غور و تدبر کے ساتھ پڑھ لیا جائے۔ یہ دیباچہ اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے اور آئندہ نمبروں کے تسلسل کے ساتھ اصل کتاب بھی برابر شائع ہوتی رہیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

# اُصُولِ قرآن

(حضرت مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہٗ)

قرآن کریم دینی کتاب ہے جس کی غرض عملی رہنمائی ہے نہ کہ محض تعلیم۔

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۱۴

کامل کتاب ہے جو ہمنے تیری طرف اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لائے!

اس کا مقصد انسان کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے جو اسکے لیے دین و دنیا دونوں میں سعادت و فلاح کا موجب ہیں اور اسیکا نام دین فطرت ہے +

میں گزشتہ نمبر میں لکھ چکا ہوں کہ قرآن کی تفصیل کی بنا علم پر ہے اور قرآن اور صحیفۂ فطرت دونوں متحد ہیں۔ جس قدر فطری حقائق کے متعلق انسان کا علم زیادہ ہوگا اسی قدر وہ زیادہ قرآن سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اسلیئے تفسیر قرآنی کی صورت یہ ہے کہ جس طرح حقائق فطرت کے مفکرین اپنی علمی تحقیق کے لیئے ایک خاص شعبہ کو جس میں اُنکو مہارت ہوتی ہے، مخصوص کر لیتے ہیں اسی طرح وہ لوگ جو علوم صحیحہ میں سے کسی علم کے ماہر ہوں قرآن کی ان مخصوص آیات کی تفصیل اپنے ذمہ لیں، اور اُن میں اپنی عمریں صرف کریں جو اُنکے علم سے تعلق رکھتی ہیں۔ جیسے عقائد، اخلاق، قانون، سیاسیات، معاشیات، نفسیات، اور حیات وغیرہ وغیرہ کے اہل فن اپنے اپنے متعلق آیات جمع کر کے اُنپر علمی بصیرت کے ساتھ غور کریں اس طرح پر قرآن کی تفصیل ہوتی جائے گی، اور عالم فطرت کی طرح اُسکے حقائق بھی

آشکارا ہوتے جائینگے لیکن علم کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ بے شک قرآن سے نصیحت حاصل کرنا اور اسپر عمل کرنا عوام کے لئے بھی سہل ہے جس طرح کہ عالم فطرت کی نعمتوں سے متمتع ہونا جاہلوں کے لیے بھی آسان ہے مگر عالم فطرت پر غور کرنے والوں نے جو ہزارہا چیزیں ایجاد کی ہیں وہ اُن کی فہم سے بالاتر ہیں، اسی طرح قرآنی حکمتوں تک رسائی علوم صحیحہ ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ پھر جس طرح فطرتی حقائق کی توضیح خود فطرتی اشیار ہی سے ہوتی ہے اسی طرح قرآن بھی اپنا شارح آپ ہی ہے، وہ مفصل کتاب ہے اور اُس کی محکم آیات کی تفصیل اسکے اندر ہے جیساکہ قرآنی دلائل کے ساتھ میں پہلے نمبر میں لکھ چکا ہوں +

اسلیئے فہم قرآن کا اصل الاُصول یہ ہے کہ اس کی آیات اسکی تفاصیل سے سمجھی جائیں۔ اور جس حد تک الفاظ لے چلیں اُس سے آگے مطلق قدم نہ بڑھایا جائے۔ کیونکہ قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اپنے معنے کے لحاظ سے کامل اور مقصود کے مطابق ہے +

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا

اور تیرے رب کے کلمات سچائی اور عدل کی رو سے پورے ہیں۔

ان کلمات سے آگے بڑھنے میں قرآنی حدود سے تجاوز لازمی ہے جو بڑی غلطیوں کا موجب ہوسکتا ہے۔ مثلاً

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِيْنَ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۲۵/۱۵

ہم کو تم میں سے آگے جانیوالوں کا بھی علم ہے، اور پیچھے آنے والوں کا بھی علم ہے حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب اُنکو حشر میں لائے گا!

مستقدم اور مستاخر کے الفاظ قرآن میں کئی جگہ پہلے اور پیچھے مرنے والوں کے لیے مستعمل ہوئے ہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ

ہر اُمت کا وقت مقرر ہے جب اُنکا وقت آگیا تو ایک گھڑی نہ وہ پیچھے رہینگے،
نہ آگے بڑہیں گے۔

یعنی اپنی اجل معینہ پر اُنکی ہلاکت واقع ہو جاتی ہے اسلیئے قرآن کی تفصیل کے مطابق "وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ- الآیہ" کے معنے یہ ہوئے کہ تم میں سے جو لوگ پہلے گزر گئے اور جو لوگ بعد میں مرینگے اُن سب کا ہم علم رکھتے ہیں اور حشر کے دن ان سب کو جمع کرینگے لیکن بعضوں نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایک حسین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز جماعت پڑہنے کے لیئے مسجد میں آیا کرتی تھی۔ کچھ لوگ آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اسکو نہ دیکھیں اور کچھ لوگ پیچھے کی صف میں رہ جاتے تھے اور رکوع کیحالت میں بغل میں سے اسکی طرف جھانکتے تھے۔ انہیں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم آگے بڑہنے والونکو بھی جانتے ہیں اور پیچھے رہنے والونکو بھی۔

یہ معنے نکالنے کے لیئے آیت میں پہلی صف اور پچھلی صف کا اضافہ کرنا پڑتا ہے اور پھر صحابۂ کرام کی ایک جماعت پر ایسا مکروہ الزام عائد ہوتا ہے جس کو کوئی شخص جو اُنکے حالات سے واقف ہے تسلیم نہیں کرسکتا اگرچہ یہ روایت صحاح ستہ کی تین کتابوں، ترمذی نسائی اور ابن ماجہ میں درج ہوگئی ہے لیکن خود قرآنی تفصیل کے مخالف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔

یہ ایک مثال نہیں بلکہ کتب تفسیر سے ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر بالروایت خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ چونکہ میں اس کے اوپر ایک جداگانہ مقالہ لکھ چکا ہوں جو رسالہ بلاغ امرتسر کے اپریل ۱۹۳۶ء نمبر میں شائع ہو چکا ہے اسلیئے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

تفسیر بالروایت ہی کی ایک شاخ اختلاف قرأۃ بھی ہے یعنی مفسر آیات کے الفاظ میں دوسری شاذ قرأتوں کی روایات سے اضافے کرلیتے ہیں: مثلاً:۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ

یہاں اُخ و اُخت کے الفاظ کو جو قرآن میں بلا قید بیان کیے گئے ہیں اخیافی بھائی بہن کے لیے مخصوص کیا گیا اس روایت کی بنیاد پر کہ بعض صحابہ لِأُمٍّ پڑھا کرتے تھے۔ اس لِأُمٍّ کے بڑھا دینے سے وراثت کے اصول میں بدیہی غلطیاں واقع ہوگئی ہیں جن کو میں نے اپنی عربی کتاب الوراثۃ فی الاسلام میں مشرح طور پر بیان کیا ہے۔ اسلیے اختلاف قرأت کی جتنی روایتیں ہیں اُن سے تفسیر میں کام لینا روا نہیں ہے کیونکہ یہ قرآن میں اضافہ ہے جس کی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۹/۱۵

ہمنے قرآن کو اُتارا ہے اور ہم اُسکے محافظ ہیں۔

ایک ایک لفظ کی حفاظت کا وعدہ ہے۔

أُتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۲۷/۱۸

تیرے رب کی جو کتاب تیری طرف وحی کیگئی ہے اُس کی تلاوت کر،

کوئی اُسکے لفظوں کو بدلنے والا نہیں۔

لہذا یہ روایتی اضافے خود قرآن کے وعدۂ الٰہی کے خلاف ہیں۔ قرآن اسی قدر ہے جو بین الدفتین محفوظ ہے اور اسی پر ہمارا ایمان ہے۔ جہانتک زبان کا تعلق ہے قرآن کی عربی آسان اور واضح ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۱۹۵/۲۶

واضح عربی زبان میں۔

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ ۲۸/۳۹

عربی قرآن جسمیں کوئی کجی نہیں ہے

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ ﴿۴۴﴾

ہمنے بس اس کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے

لہذا قرآنی الفاظ کے وہی معانی لیے جائینگے جو عربی زبان کے مطابق صحیح ہوں ایسے معانی نہیں لیے جاسکتے جنکو اہل زبان نہ سمجھتے ہوں۔ مثلاً:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ﴿۳۱﴾

اور بعض آدمی ہیں جو دل بہلانیوالی باتونکے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو بلایقین علم کے گمراہ کریں۔ اور اللہ کی راہ کو مذاق بنالیں۔

یہاں لہوالحدیث کا ترجمہ غنا کیا گیا ہے یعنی راگ۔ لیکن عرب کبھی لہوالحدیث سے غنا نہیں سمجھ سکتا۔ نہ عربی زبان میں کہیں اس معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ خود آیت اس مفہوم کو قبول کرنے سے انکاری ہے کیونکہ اسمیں لہوالحدیث کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ اس سے گمراہ کرنیکا کام لیا جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ وہ یقین کے درجے تک نہیں پہنچتی۔ تیسری اللہ کی راہ اس سے مذاق بنجاتی ہے۔ یہ تینوں صفتیں راگ میں کہاں ہیں راگ سے تو غرض نشاط وطرب ہے نہ کہ گمراہ کرنا یا دین کو مذاق بنانا۔ اور پھر اُس کو یقینی یا غیر یقینی ہونے سے کیا واسطہ۔ یہ تو صرف روایات اور افسانے ہیں جن میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔

الفاظ کے جو معنی لغت میں بیان کیے گئے ہیں اُنکی بنیاد سماع پر ہے اور کتب لغت کے جامع تمام تر عجمی تھے جنھوں نے چوتھی صدی سے اُنکی تدوین شروع کی اسوقت تک الفاظ کے جو معانی عام طور پر یا تفسیر و حدیث و فقہ میں رائج ہو چکے تھے اُنھوں نے درج کر لیے ہرچند تحقیق و جستجو میں کمی نہیں کی لیکن پھر بھی انسانی کوشش ہے۔ اسلیے لغت کوئی حتمی دلیل نہیں ہے، الفاظ کے معانی اختلاف کیصورت میں خود قرآن سے متعین کیے جاسکتے ہیں۔

اصول و قواعد لسانی کی ترتیب بھی نزول قرآن کے بعد ہوئی ہے بلکہ انکا بڑا حصہ ائمۂ فن نے خود قرآن ہی سے استنباط کیا ہے لہٰذا ان اصولوں کا جو سراسر قیاسی اور ظنی ہیں۔ اسی حد تک لحاظ رکھا جائے گا۔ جب تک کہ کوئی قوی سبب اختلاف کا موجود نہ ہو

ایک اہم اصول فہم قرآن کا یہ ہے کہ اسکی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے +

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝

اور اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی دوسرے کیطرف سے ہوتا تو اسمیں لوگ بہت اختلاف پاتے

اس لیے کسی آیت کی ایسی تفسیر نہیں کیجاسکتی جو دوسری آیت کے خلاف پڑتی ہو۔ مثلاً :-

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۝

اور پوجتے ہیں اللہ سے نیچے جو چیز نہ برا کرے نہ انکا بھلا کرے اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ تو کہہ کہ تم اللہ کو جتاتے ہو جو اسکو معلوم نہیں کہیں آسمانوں میں نہ زمینوں میں۔

یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر مرحوم کا ہے۔ میں نے اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں لکھا کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں لایعلم کا فاعل اللہ کو قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ دوسری آیت میں اللہ نے فرمایا ہے +

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۝

جس شخص کو بھی وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں اللہ اسکو جانتا ہے۔

اسلیے شاہ صاحب کا ترجمہ براہ راست قرآنی تصریح کے خلاف ہے، علاوہ بریں مشرکین اللہ کو اپنے معبودان باطل کی خبر نہیں دیتے تھے بلکہ انکے توسط سے خود اپنی خبر اللہ تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اور یہی معنی سفارشی جاننے کے ہیں۔ ورنہ اگر وہ خود اللہ کو اپنے معبودوں کی خبر دیتے تو اپنا حال بھی اس سے کہہ سکتے تھے۔ بیچ میں سفارش کی کیا ضرورت تھی۔ اس

آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے:-

اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو انکو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع،
اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں کہہ دے کہ کیا تم اللہ کو
انکے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جنکو آسمان اور زمین کی کسی شے کا علم نہیں ہے

بعض قدامت پرست مولویوں نے نہایت سخت لہجے میں میری مخالفت کی. اور دلیل یہ لائے کہ قرآن میں ہر جگہ "نبا" کے بعد جب آئی ہے، وہ تعدیہ کی ہے استعانت کی نہیں حالانکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ قرآن میں ایک ایک لفظ کئی کئی معنوں میں مستعمل ہوا ہے ب اگر چند آیتوں میں تعدیہ کے لیئے ہے تو استعانت کے معنے اس سے کیسے سلب ہوگئے اور کیوں اس معنی میں نہیں آسکتی حقیقت یہ ہے کہ اُن کی مخالفت کی وجہ یہ نہ تھی بلکہ شخصیت پرستی تھی۔ انکے نزدیک اللہ لا یعلم ہو تو ہو مگر شاہ عبدالقادر کے علم پر حرف نہ آنے پائے۔ انکا خیال یہ ہے کہ مشرکین کے معبود چونکہ باطل ہیں اور حقیقتاً وجود نہیں رکھتے اس لیئے اللہ انکو جانتا ہی نہیں مگر کیا مشرکوں کے عقیدوں میں اُنکا وجود نہیں ہے اور اللہ تعالےٰ موجودات ذہنی کا علم نہیں رکھتا -؟

قرآن کی تفسیر میں نسخ کے عقیدہ نے بھی بہت خرابیاں پیدا کی ہیں، حالانکہ قرآن میں جو کچھ تغیر و تبدل ہونا تھا وہ اسکے نزول ہی کے زمانہ میں ہو چکا۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۲/۱۰۶

ہم جو آیت منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں اُس سے بہتر یا اسی جیسی لا دیتے ہیں

دو ہی صورتیں تھیں. منسوخ کر دینا یا پیغمبر علیہ السلام کے دل سے بھلا دینا ان ہر دو صورتوں میں اسکے بجائے دوسری آیت نازل کردی جاتی تھی +

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّکَانَ اٰیَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۱۶/۱۰۱

اور ہم جب ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لاتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے

جو کچھ اُتارتا ہے تو کفار کہنے لگتے ہیں کہ تو اپنے دل سے بناتا ہو

آیت کے بدلہ میں آیت اُتار دینے سے واضح ہو گیا کہ جو آیت منسوخ کیگئی یا بھلا دی گئی اُس کی جگہ دوسری آیت آگئی۔ اِس لیئے قرآن میں جو آیتیں موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی منسوخ نہیں اور جن لوگوں نے بعض آیات کو باہم متعارض سمجھ کر ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا ہے وہ خود انکی فہم کا قصور ہے۔ قرآنی تعلیمات میں مطلق تعارض نہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی طرف سے قرآن میں کسی لفظ کی تبدیلی کا حق نہ تھا۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۝ ۱۵/۱۰

کہدے کہ مجھے حق نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اسکو بدل سکوں

جب رسول اللہ کو قرآن کے کسی لفظ بدلنے کا اختیار نہیں تھا تو اُس کی کسی آیت کو منسوخ کرنیکا اختیار کیونکر ہو سکتا ہے جن لوگوں نے روایات کی بناء پر آیات کو منسوخ قرار دیا ہے انھوں نے قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے۔ مثلاً۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ ۱۸۰/۲

تمہارے اوپر فرض کیا گیا کہ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو والدین اور اقرباء کے لیئے وصیت کر جائے۔ یہ اللہ سے ڈرنے والوں پر ایک حق ہے!

صریح الفاظ میں اللہ نے مالداروں پر ورثہ کے لیئے وصیت فرض کی اور حقاً علی المتقین فرما کر اس کو لازمی قرار دے کر موکد فرمایا پھر آیت وراثت میں بھی تین جگہ "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ" فرما کر توضیح کر دی کہ توریث کا اجراء وصیت کے بعد ہو گا۔ مگر لوگوں نے "لا وصیۃ لوارث" دیا ورکہو وارث کے لیئے وصیت نہیں ہے، کی روایت سے وصیت کی اِس موکد آیت کو منسوخ

کرڈالا۔ اور یہ نہ سمجھ سکے کہ وصیت ورثہ کی شخصی مصلحتوں کے لیئے ہے جو توریث میں ممکن نہیں کیونکہ وارثوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ فرض کرو ایک شخص کے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک پر اُسنے ہزار دل روپیہ خرچ کیا ہے اور اُس کو تعلیم دلاکر اس قابل بنادیا ہے کہ وہ خوب کماتا ہے اور باپ کی دولت سے مستغنی ہے اور دوسرا بیٹا آج پیدا ہوا ہے وراثت کا قانون کُلی ہے وہ شخصی مصالح کا لحاظ نہیں کرے گا اور دونوں کو برابر حصّے دیدے گا۔ لیکن مصالح عائلی کا تقاضا اُسکے خلاف ہے اسی قسم کے حالات کے لیئے وصیت فرض کیگئی ہے تاکہ مورث اپنے ورثہ کی مناسب ضرورتوں کا لحاظ رکھ سکے جس کو فقہاء نے ایک خبر احاد کی بنا پر منسوخ کرڈالا ✦

لہٰذا قرآن جو بین الدفتین ہے اُس کی کوئی آیت یا کوئی حرف منسوخ نہیں ہے، اس عنوان پر مفصل بحث ہماری کتاب تاریخ القرآن میں ہے۔ یہ چند موٹے موٹے اصول ہیں باقی ہر قسم کے جزی قواعد بھی قرآن سے نکلے جاسکتے ہیں ✦

# مرثیۂ اقبال علیہ الرحمۃ

(جناب اسد ملتانی)

حضرت علامہ ؒنے جو فلسفۂ غم کے متعلق فرمایا ہے کہ سازِ حیات کے بہت سے خوابیدہ نغمات مضرابِ غم سے بیدار ہوتے ہیں۔ اُس کی تصدیق جناب اسد کے اس مرثیے سے ہوتی ہے، جناب اسد کی شاعری میں جوش و اُمید اور بصیرت و ایقان کی وہ تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو ایک حقیقی اسلامی شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے انکے بربطِ ہستی کے تاروں میں اثر و درد اور سوز و گداز کے پُر لطف نغمات شاید کسی حادثۂ جانکاہ کے لیے چھپا رکھتے تھے بایں ہمہ بڑی خوبی یہ ہے کہ ہمارے خوددار شاعر نے ان نواہائے غم کو کچھ ایسا پردہ ہائے ساز میں چھپایا ہے کہ مرثیہ بجائے اظہارِ غم کے پردہ دارِ غم ہوگیا ہے، آنکھ میں ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کو آبگینۂ دل کیطرف لوٹا دینا اور یوں آبروئے ضبط کو قایم رکھ لینا کچھ آسان مرحلہ نہیں ہے پھر یہ امر قابلِ غور ہے کہ ہجومِ غم نے جناب اسد کی خصوصیاتِ شاعری کو اس مرثیہ میں بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا اور اس طرح سحابِ اشک میں سے گزری ہوئی شعاعِ اُمید نے جو اثر و جذب میں ڈوبی ہوئی قوسِ قزح پیدا کی ہے وہ اُردو زبان کے مرثیوں میں پہلی مثال ہے۔

کس قدر مبارک ہیں وہ آنکھیں کہ جن کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو فرشتوں کے

دامن پونچھ لیں اور کس قدر بلند مقام ہیں وہ ہستیاں جن کی یاد میں کسی کی خونفشانی کو یہ مرتبہ حاصل ہو جائے۔ (طلوع اسلام)

الٰہی کیسی قیامت کی یہ سحر آئی          جو آج رحلتِ اقبال کی خبر آئی
وفاتِ شاعرِ مشرق کی اطلاع سُنی          کہ روح و قلب میں برقِ بلا اُتر آئی
زمانہ ہو گیا آنکھوں میں ایسا تیرہ و تار          کہ زندگی میں جھلک موت کی نظر آئی
خدا کرے غلط ہو یہی تھی خواہشِ دل          خبر اگرچہ نہایت ہی معتبر آئی
ہمارا گنجِ گرانمایہ اسکے ہاتھ لگا،          گرم سکے جو ہم تو قضا کی مراد بر آئی
ہزار حیف دوا کوئی کارگر نہ ہوئی          دعا فلک پہ گئی اور بے اثر آئی
سیاہ روز ہوئی آج ملتِ بیضا          کہ شامِ غم سے بھی اک تیرہ تر سحر آئی

امامِ فلسفہ و شاعری کا ماتم ہے
مہِ صفر بھی ہمارے لئے محرم ہے

جو کائنات مسخر بھی ہو تو کیا حاصل          نہیں ہے موت پہ انساں کا اختیار افسوس
نہیں ہے ہستیٔ موہوم کا یقیں کچھ بھی          نہیں ہے عمرِ دو روزہ کا اعتبار افسوس
روانہ ہو گیا ملت کے باغِ ویراں سے          خزاں کے دور کا پیغمبرِ بہار افسوس
بھڑکنے پائی نہ اسکی نوائے آتشِ گل          کہ جل کے رہ گئی خود عندلیبِ زار افسوس
چمن میں ایک نئے دور کا کیا آغاز          اور آپ چل دیا صد ہزار افسوس
ابھی نہ آیا تھا اُن گلبنوں پہ رنگِ بہار          جنہیں وہ کرتا تھا اشکوں سے آبیار افسوس
خود اپنی آنکھوں سے وہ فصلِ گل نہ دیکھ سکا          تمام عمر کیا جس کا انتظار افسوس

جو بعد مرگ طلائیش کا پیام تو کیا
پسِ فنا ہوا محفل کا اہتمام تو کیا

کمی نہیں ہے زمانے میں رہنماؤں کی          مگر وہ راہنماؤں کا رہنما نہ رہا

زمانہ کانپتا تھا جسکی بے نیازی سے — وہ مردِ مومن و درویشِ بے نوا نہ رہا
کھُلے نہ اُسکے مقامات اہلِ ظاہر پہ — کہ انجمن میں وہ عارف و قلندرانہ رہا
کریگا اب لِ یزداں بھی یہ کمی محسوس — کہ ایک بندۂ گستاخ لب کشا نہ رہا
تھا جسکا زمزمہ غالب نوائے فطرت پہ — جہاں میں آج وہ شاعر غزل سرا نہ رہا
جہاں کو شعرِ دلآویز کے بہانے سے — سُنا رہا تھا جو پیغام آشنا نہ رہا
بجھا دل ایسا کہ اقبال کی وفات کے بعد — اسدؔ مرے لیے جینے میں کچھ مزا نہ رہا

ذرا بھی جی نہیں لگتا جہانِ فانی میں
خلا سا ہوتا ہے محسوس زندگانی میں

تجھے خدا نے جو واپس بُلا لیا اقبالؔ — ترے پیام کی تکمیل ہو گئی ہو گی
اب آسمان تری آمد کے منتظر ہونگے — زمیں پہ تیری ضرورت نہیں رہی ہو گی
جہان اور جو آگے ہیں اِن ستاروں سے — وہاں طلب ترے فکرِ بلند کی ہو گی
جو پڑ گئی ہے ضرورت تری نوا و نکی — فضائے خُلد کے نغموں میں کچھ کمی ہو گی
ہم ایسی باتوں سے دل کو ہزار بہلائیں — مگر نہ دُور طبیعت کی بےکلی ہو گی
مٹے گا داغ نہ دل سے تری جُدائی کا — خلش نہ کم ترے دردِ فراق کی ہو گی
میں تجھ سے چند مہینے ہوئے کہ مل آیا — خبر نہ تھی یہ مُلاقات آخری ہو گی

کہاں کرائیگی "جاوید منزل" اب تری دید
کہ تو نے جا کے بسالی ہے منزلِ جاوید

ترا مقام تو ہے شاعری سے بالاتر — ہے تیری ذات پہ البتہ شاعری کو ناز
یہ شاعری ہے کہ شعر و سخن کے پردے میں — خودی کی جلوہ نمائی خُدا سے راز و نیاز
دلوں کو دے جو نئی زندگی وہ دردِ واثر — کرے جو روح کی نشو و نما وہ سوز و گداز
نگاہ جاتی ہوئی کائنات کے دل تک — سخن پہنچا ہوا تا بہ سرحدِ اعجاز

بہت طویل زمانے کے بعد آیا تھا  فضائے ہند میں اک موجۂ نسیمِ حجاز
شمیم بیز، دل آویز اور جنوں انگیز  ولیک حیف! بہت تیز اور سبک پرواز
جو اس قدر سفرِ آخرت میں جلدی کی  تھا تیرے واسطے کارِ جہاں بس اتنا دراز؟

کسی کو اور گوارا تھا انتظار ابھی
کچھ اور دن اُسے رکھنا تھا بیقرار ابھی

یہ کیا قضا و قدر کی ستم ظریفی ہے!  اسیرِ دامِ اجل شاعرِ حیات ہوا
نہیں، ایک اور جہاں کی تلاش میں شاید  رواں وہ طالبِ اسرارِ کائنات ہوا
جو مطمئن نہ ہوا جلوۂ صفات سے وہ  تو رہ نوردِ سوئے حریمِ ذات ہوا
حیات کے حرمِ پاک میں وہ اب بھی ہے  فنا کا بتکدہ محرومِ التفات ہوا
کہا: میں موت سے ڈرتا نہیں مسلماں ہوں  بوقتِ نزع بھی ثابت ترا ثبات ہوا
خوشی سے خلد میں جا اے گروہِ عشق کے عاشق!  یہ عشق تیرے لیے ضامنِ نجات ہوا
ترے تو گوشۂ تربت میں روشنی ہو گی  مگر ہمارے لیے آہ! دن بھی رات ہوا

ہوا جہاں میں یکایک یہ انقلاب، افسوس
غروب ہو گیا مشرق کا آفتاب، افسوس

بہت دنوں سے یہاں عارفانِ صاحبِ دل  نہ مسجدوں میں تھے باقی نہ خانقاہوں میں
جو تھے فقیر تو رہبانیت کے گوشہ نشیں  جو تھے امیر تو شاہوں کی بارگاہوں میں
ترے وجود نے اک بار کر دیا تازہ  زمانہ رومی و رازی کا پھر نگاہوں میں
کبھی جو تھی دلِ رومی سے عقلِ رازی میں  وہ روشنی نظر آئی تری نگاہوں میں
ترے کلام نے توڑا فرنگ کا وہ فسوں  سراغِ زیست دکھاتا تھا جو نگاہوں میں
کلیم و خانۂ فرعون کی مثال ہوئی  وہ تربیت تری مغرب کی درسگاہوں میں
صراطِ عشق پہ تو نے لگا دیا اُن کو  بھٹک رہے تھے جو عقل و ہوس کی راہوں میں

یہ رمز ہے شعرا پر تری فضیلت کی
دلوں میں ہے تری عظمت یہی محبت بھی

وہ شعر و فلسفہ کا بحرِ بیکراں اقبال — جنونِ عشق و محبت کا رازداں اقبال
وہ فلسفے میں خودی کا پیامبر اقبال — وہ شاعری میں حقیقت کا ترجماں اقبال
وہ جسمِ قوم میں مثلِ دماغ و دیدہ و دل — وہ روحِ فطرتِ اسلام کی زباں اقبال
یہ مانتا ہی نہیں دل کہ پا گیا ہے وفات — وہ میرا مرشد و استاد مہرباں اقبال
نہیں نہیں کبھی اقبال مر نہیں سکتا — سپردِ خاک ہوا جو وہ ہے کہاں اقبال
وہ کر رہا تھا کئی دن سے آہیں در پیدا — گیا نہ عاقبت آں سوئے آسماں اقبال!
دلوں میں تا بہ قیامت رہیگی یاد اُسکی — اگرچہ آج نگاہوں سے ہے نہاں اقبال

جہاں میں اُس کا قیام اور جہانیں اسکا کلام
دوگونہ ہو گئی حاصل اُسے بقائے دوام

نظر ہے کتنی ہی محدود و نارسا اُنکی — جنہیں گلا ہے کہ اقبال سخت کوش نہ تھا
شعاعِ مہر کی صورت حیات پرور تھا — عجب نہیں جو بظاہر وہ گرم جوش نہ تھا
نسیمِ صبح کے مانند تھا وہ غنچہ کشا، — تباہ کاریٔ طوفانِ پُر خروش نہ تھا
اُسی کی مے کا اثر تھا یہ سب اگرچہ خود — شریکِ شورشِ زندانِ بادہ کوش نہ تھا
خریدنا اُسے چاہا جہاں نے بہتیرا — مگر وہ بندۂ آزاد خود فروش نہ تھا
تمام زندگی اُسکی تھی اک جہادِ عظیم — وہ گرچہ تیغ بدست و کفن بدوش نہ تھا
نگاہِ اہلِ محبت میں تھا ولی اقبال — کمی جو تھی تو یہی تھی کہ خرقہ پوش نہ تھا

اگرچہ آج جہاں سے گزر گیا اقبال
جو کام کرنے کو آیا تھا کر گیا اقبال

وہ خود نہیں مگر اُس کا پیام باقی ہے — وہ چپ ہوا مگر اُس کا کلام باقی ہے

وہ آسماں کی طرف اُڑ گیا، مگر اُس کا — زمینِ شعر پہ نقشِ دوام باقی ہے
اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی — وہ مے وہ خم، وہ صراحی وہ جام باقی ہے
جو رہ گئی ہے رگِ تاک میں وہی نہ بہی — کبھی ہوئی تو مئے لالہ فام باقی ہے
وہ مردِ پاک نظر جس کی طرح ڈال گیا — ابھی وہ کام بہت ناتمام باقی ہے
وہ جس نظام کی رکھتا تھا آرزو دل میں — بہت کچھ اُسکا ابھی انتظام باقی ہے
اگرچہ صدمہ ہے صبر و ثبات سے بڑھ کر — سنبھال ہوش کہ دُنیا میں کام باقی ہے

کہیں نہ جوشِ عمل سیلِ اشک میں بہہ جائے
جو بات کہہ گیا اقبال وہ یونہی رہ جائے

اُٹھو مقابلۂ گردشِ زمانہ کریں — حیات و موت کو پابستۂ قضا نہ کریں
فنا یہی ہے کہ دلمیں نہ ہو یقینِ بقا — بقا یہی ہے کہ اندیشۂ فنا نہ کریں
عجب نہیں کہ یہی بجلیاں حوادث کی — ہمارے توسنِ ہمت کو تازیانہ کریں
اسی سے ملتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے شاید — وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں
نہ مل سکا طلبِ نیم گرم سے کچھ بھی — اب ایک بار تقاضائے والہانہ کریں
جمالِ یار تو بیتاب خود نمائی ہے — پر اہلِ دل بھی تو پیدا کوئی بہانہ کریں
اسی لیے ہوا حاصل رفعتِ جبیں کی طلب — کہ سجدہ کر کے بلند اُنکا آستانہ کریں

یہی ہے حضرتِ اقبال کا پیامِ حیات
اسی پیام سے حاصل کریں دوامِ حیات

# سوراجی اسلام

## رازی

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب کانگریس کے دستورِ اساسی میں یہ بات موجود ہے کہ سوراج حاصل ہونے کے بعد ہندوستان کی مختلف اقوام کی مذہبی آزادی برقرار رکھی جائیگی تو پھر مسلمان اپنے مذہب کے تحفظ کے لیئے اور کیا ضمانت چاہتے ہیں یہ دلیل ایسی نظر فریب اور خوش آئند ہے کہ اچھے اچھے سمجھدار اسکے دامِ تزویر میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور عوام جو بالکل سطحی بین ہوتے ہیں انکے پاس تو اسکا جواب ہی کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن آیئے تو ذرا دیکھیں کہ قرائن سے جو کچھ پتہ چلتا ہے اسکی رو سے سوراج حاصل ہونے کے بعد جس مذہب کی آزادی مسلمانوں کو حاصل ہوگی وہ کونسا مذہب ہوگا کیا وہ اسلام ہی ہوگا یا کسی اور چیز کا نام اسلام رکھدیا جائیگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ سوراج کے بعد ہندوستان کی "متحدہ قومیت" کا نظامِ حکومت جمہوری ہوگا اور اس متحدہ قوم کی تقدیروں کے مالک مختلف خیالات کے نمائندوں کی جماعت کے افراد ہونگے جنکی کثرتِ آراء سے تمام معاملات کا فیصلہ ہوا کریگا اور جو معاملہ اکثریت کی رائے سے طے ہو جائیگا وہ ملک کا قانون بن جائیگا جسکی خلاف ورزی جرم ہوگی۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ مختلف سیاسی معتقدات کی جماعتیں جنکے ہاتھ میں زمامِ حکومت ہوگی۔ مذہب سے مفہوم کیا لیتی ہیں۔ اسلیئے کہ جب مذہبی آزادی یا مذہبی معاملات میں دخل اندازی کا سوال پیدا ہوگا تو سب سے پہلے تو یہی سوال اٹھے گا کہ وہ مذہب جسکی آزادی کا حکومت نے وعدہ دیا ہوا ہے اسکی تعریف کیا ہے کون کون سے معاملات مذہب کی حدود کے اندر ہیں اور کون کون سے اسکے باہر۔

سب سے پہلے قدامت پسند ہندوؤں کی اس جماعت کو لیجئے جسکے نمائندے مہاتما گاندھی ہیں

ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ یہ جماعت اپنے اس اعلان میں مخلص ہے کہ سوراج کے بعد مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اس جماعت کے نزدیک مذہب نام ہے چند رسومات کا اور چند عبادات کا اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ عقائد یا عبادات میں بھی کسی کا اشتراک یا اتحاد ہو۔ ایک فرقہ کرشن بھگت ہے اور دوسرا رام اوپاسک۔ سناتن دھرم والے مورتی پوجا کرتے ہیں لیکن آریہ سماج والے مورتی کھنڈن (بت شکنی) کے قائل ہیں۔ ویدانت کے قائل مادہ کو مایا (سراب) سمجھتے ہیں۔ اور آریہ سماجی روح مادہ دونوں کو ازلی اور ابدی مانتے ہیں بنگال کے ہندو کالی ماتا کی پوجا کرتے ہیں اور ستیارتھ پرکاش اس دیوی کو ڈائن قرار دیتی ہے سناتن دھرمی ورنوں کی تقسیم پیدائش کے لحاظ سے کرتے ہیں اس لئے اچھوت ان کے نزدیک پیدائشی اچھوت ہیں لیکن آج خود مہاتما جی اس بات کے لئے برت رکھنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ اچھوت کو اچھوت کیوں سمجھا جاتا ہے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود یہ سب ہندو ہیں اور ان میں سے کوئی بات بھی ہندو دھرم کے خلاف نہیں حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو جو ناستک ہیں خدا کے بھی منکر ہیں وہ بھی ہندو ہیں اس لئے اس جماعت کے نزدیک تو مذہب محض کسی ذہنی نظریہ کا نام ہے جسکی کوئی تعریف ہی نہیں کیجا سکتی۔ باقی رہے معاشرتی معاشی سیاسی معاملات تو وہ مذہب کے احاطہ سے باہر ہیں انکا حل ارباب سیاست کے ذمہ ہے۔ مذہب سے متعلق یہی نظریہ آج انگریزوں کے سامنے ہے۔ انکے سامنے بھی کلیسا اور سلطنت دو الگ الگ شعبے ہیں بلکہ وکٹوریہ کے منشور کی رو سے آج بھی مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں کامل "آزادی" حاصل ہے۔ اور حکومت مذہبی معاملات میں دخل انداز نہیں ہوتی لیکن یہ مذہب ہے کیا جو حکومت کی دخل اندازی سے باہر ہے۔ وہی چند رسومات اور عبادات آپ دن رات قرآن کریم کا درس دیتے رہئے کوئی مزاحم نہیں ہوگا لیکن اگر آیت کی تفسیر حکومت وقت کے قانون سے ٹکرا جائے تو اس مذہبی آزادی کا جو حشر ہوتا ہے اسکا حال مقدمۂ کراچی کے اسیران اور مالٹا کے نظر بندوں سے پوچھیے۔ اس لئے کہ

قرآن کی تلاوت تو مذہب میں داخل ہے لیکن ملکی اور سیاسی معاملات میں تو آپکو ملک کے قانون کے تحت رہنا ہوگا۔ مذہب "ثواب" حاصل کرنے کے لیئے ہے نہ کہ زندگی کے معاملات کا عملی حل تلاش کرنے کے لیئے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اس نظریہ کے ماتحت آپ کو جس قسم کی مذہبی "آزادی" حاصل ہوگی وہ آج کی "غلامی" سے کتنی بہتر ہوگی۔

قدامت پرستوں کی دوسری جماعت وہ ہے جسکی نمائندگی کا شرف ہندو مہا سبھا کو حاصل ہے اور یہی وہ جماعت ہے جسکی ملک میں اکثریت ہے کچھ وقت ہوا کہ انکی اکثریت میں کچھ شبہ ہونے لگا تھا جبکہ اچھوتوں نے تقاضا کیا تھا کہ ہمیں جداگانہ نیابت حاصل ہونی چاہیئے۔ اسوقت ان مظلوموں کی ہمدردی کے جذبہ نے جوش کھایا بڑے بڑے مہاتما منش ہندوؤں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پونہ میں ان تیاگ برت رکھے گئے بڑے بڑے اونچی گوت کے ہندوؤں نے اپنے آپ کو ہریجن کہلانا شروع کر دیا۔ اور اس مظلوم طبقہ کی زبوں حالی کے احساس نے اسوقت تک چین نہ لینے دیا جبتک یہ یقین نہ ہوگیا کہ ہندو مہا سبھا کی اکثریت خطرے میں نہیں ہے مہاتما جی نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ اب زندگی کا مقصد اسی اکثریت کے تحفظ کو قرار دے لیا ہے۔ اس طبقہ کے جو خیالات مسلمانوں کے مذہب سے متعلق ہیں اس کے لئے دیوتا سروپ بھائی پرمانند۔ ڈاکٹر مونجے اور مسٹر ساورکر کے شبھ نام کافی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس حکومت کے نظام میں اکثریت اس جماعت کی ہوگی اسمیں اقلیت کے مذہب کا کیا حشر ہوگا۔ اکثریت کی تو آج بھی یہ حالت ہے کہ سناتنی بیچارے لاکھ چلا رہے ہیں کہ سارداا یکٹ ہمارے دھرم کے خلاف ہے کوئی ایک نہیں سنتا وہ چیخ رہے ہیں کہ اچھوتوں کے لیئے مندروں کے دروازے کھول دینا یکسر ہندو دھرم کو اکھو تر کر دینا ہے لیکن سیاست کی مصلحت کوشیاں اکثریت کے کان بند کیئے ہوئے ہیں۔ جب خود اپنے ہاں یہ حالت ہے کہ مہا سبھائیوں کی اکثریت سناتن دھرمیوں کے مذہبی احساسات کی کچھ پرواہ نہیں کرتی تو یہی اکثریت ملیکش مسلمانوں کے مذہب کا جسقدر پاس کرے گی ظاہر ہے۔

اب اس جماعت کو لیجئے جو روشن خیال جدت پسند ( ADVANCED )

طبقہ کہلاتا ہے اور جسکی قیادت پنڈت جواہر لال نہرو کو حاصل ہے یہ اشتراکی خیالات کے حامی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں خدا اور آخرت پر ایمان کی دھجیاں اُڑائی جاتی ہیں اُس میں اسلام ہی نہیں بلکہ خود عیسائیت کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ جوان خیالات سے متاثر کیا جارہا ہے۔ ایمانیات سے اسکا استہزاء خود بتا رہا ہے کہ مذہب سے متعلق انکا زاویہ نگاہ کیا ہے۔ پنڈت جی اور انکے رفقائے کار کی یہ کوشش ہے کہ اشتراکیت آنیوالے ہندوستان کا سیاسی مذہب بن جائے اس نظریہ کی عملی اشاعت میں بعض سیاسی مصالح ابھی انکے راستہ میں حائل ہیں لیکن باین ہمہ جس سرعت کے ساتھ اس کو عام کیا جارہا ہے اسکا نتیجہ ظاہر ہے اسلام خود سرمایہ داری کا دشمن اور اشتراکیت کا حامی ہے لیکن اس اشتراکیت کا نہیں جسکی تخلیق اس انقلاب پسند طبقہ کے اس انتقامی جذبہ کی رہین منت ہے جو زار کی حکومت کے خلاف اسکے دل میں موجزن تھا اور جسکا اصول صرف یہ تھا کہ ہر وہ چیز جو زار کے وقت میں دُنیا میں موجود تھی۔ تباہ کر دینے کی لائق ہے۔ یہی وہ اشتراکیت ہے جو ہندوستان کے انقلاب پسند طبقہ میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے اور جو محض روس کی نقالی ہے۔ غلام نژاد قوم ہمیشہ مقلد ہوا کرتی ہے۔ طواف اندر سرشتِ برہمن است۔ رسالۂ کلیم اس مسلک کی نشر و اشاعت میں بڑا سرگرم رہتا ہے کہ اس سے نوجوانوں میں مقبولیت بڑھ جاتی ہے چنانچہ اسکا کوئی پرچہ ایسا ہوتا ہوگا جسمیں خدا اور آخرت پر ایمان کی تضحیک نہ کیجاتی ہو مثلاً مارچ کے پرچہ میں ناظر کے نام سے ایک مضمون چھپا ہے جسمیں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

> خدا کے تصور کی ابتدا انسان کے اس دور سے شروع ہوئی جبکہ ذہن انسانی عالم طفولیت میں تھا وہ فطرت کے عظیم الشان مظاہر کی توجیہ نہ کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ انکو فوق العادت ہستی سے منسوب کر دے ..... مذہب کا توہم پرستی کے ساتھ ہونیکا ثبوت یہ ہے کہ آج تک بھی جہاں جہاں جہالت زیادہ ہے اور علم کی روشنی کم ہے وہاں مذہب کا دور دورہ ہے مذہب ایک غیبی چیز ہے اور غیبی چیزوں کو تاریکی میں زیادہ فروغ ہوتا ہے

اسکے بعد حیات بعد الممات کے عقیدہ کی مخالفت کی گئی ہے آخر میں رقمطراز ہیں کہ ہندوستان چونکہ علوم وفنون اور تہذیب وتمدن میں بہت پیچھے ہے اس لئے یہاں فی الحال مذہب کو رہنے دیا جائے لیکن مذہب کو اجتماعی حیثیت نہ دیجائے اسکو خالص شخصی یا انفرادی چیز سمجھنا چاہیئے اسطرح اسکی پبلک حیثیت رفع ہو کر خالص پرائیویٹ یا نجی حیثیت باقی رہے گی۔

---

یہ تو تھے غیر مسلم حضرات کے مختلف طبقے یا مسلمان کہلانے والوں میں سے وہ طبقہ جسے متشدین کہا جاسکتا ہے لیکن آنے والے اسلام کے متعلق جو نظریہ عام "قوم پرست" مسلم حضرات پیش کر رہے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ افسوسناک اور مایوس کن ہے ان حضرات کی تحریروں اور تقریروں سے واقف ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کا اسلام وہ پیش کر رہے ہیں وہ خود انکے اپنے ہی دماغوں کی ساخت ہے کتاب وسنت کے اسلام سے اسکو کچھ علاقہ نہیں انکے نزدیک بھی مذہب چند رسومات وعبادات کا ہی نام ہے۔ اس کے بعد عام معاشرتی، معاشی، سیاسی معاملات سب "دنیاوی" امور ہیں جنکا مذہب سے کچھ واسطہ نہیں۔ مثال کے طور پر دو ایک مشہور "قوم پرست" مسلم حضرات کے خیالات ملاحظہ فرمایئے ڈاکٹر سید محمود سابق سکرٹیری آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور کانگریسی حکومت صوبہ بہار کے وزیر کا ایک مضمون رسالہ جامعہ بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے اس امر کی تلقین کی تھی کہ ہندوستان جیسے ملک میں مذہب اس قسم کا ہونا چاہیئے جس قسم کا دین اکبر نے ایجاد کیا تھا۔ اکبر جیسوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ

"بعض نے اپنے ولولہ وجوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشوونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جاسکتیں"

آنے والے نظام حکومت کے ماتحت اس نئے "دین الہی" کے ماننے والوں کا نام کیا ہو گا۔

اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"لفظ ہندی کو زبان کے لئے نہیں بلکہ اہل ہند کے لئے اختیار کرنا چاہئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں صرف اسکا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بنجاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس براعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کرلیں۔[1]"

کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب کا ایک مضمون جمعیۃ العلماء ہند کے آرگن الجمعیۃ بابت رجب ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں میں پہلے کونسی بات میں یگانگت اور وحدت تھی جو وہ اب اپنی الگ وحدتِ قومی کے لئے چلا رہے ہیں۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ

"اس اعتبار سے ہم آج ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے۔"

اسی شعبۂ اسلامیات کے ایک رکن جناب منظر رضوی کا ایک مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے اخبار مدینہ بابت یکم نومبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ

مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانو ملجاؤ"، سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے اس اتحاد کی ضرورت کیا ہے۔ اسکا

---

[1] یعنی خدا نے تو یہ فرمایا تھا کہ هو سمّٰكم المسلمين - اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے - اور یہ کہ من احسن قولا ...... یعنی کہ اس سے بہتر بات کرنے والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے - عمل صالح کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں لیکن مسلمانوں کے یہ نمایندہ حضرات ہیں کہ ان کو اس بات سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ کوئی اپنے آپ کو مسلمان کہے - یہ ہے سورا جی اسلام کی ایک خفیف سی جھلک - آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ (رازی)

مقصد کیا ہے جہانتک توحید رسالت مذہبی معتقدات اور مذہبی حرکت و عمل کا تعلق ہے وہ آپسمیں ملے ہوئے ہیں بالکل متحد ہیں انمیں کوئی اختلاف نہیں اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہو گا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفاد کے لئے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے وہ ہرگز متحد نہیں ہو سکتے۔ اور نہ انکو متحد ہونا چاہیئے (اقتباسات بحوالہ ترجمان القرآن)

رسالہ کلیم کے مدیر جناب جوش ملیح آبادی دسمبر ۳۷ء کے پرچہ کے اشارات میں فرماتے ہیں

اس کے علاوہ اپنے کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد کو کہنا جغرافی صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی قومیت تو ہمارا گوشت پوست اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے! ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت و وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جسکا تبدیل کر دینا طاقت بشری سے باہر ہے لہ

ایک اور "قوم پرست" بزرگ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں وہ حضرت علامہ علیہ الرحمہ کے مشہور نظریہ قومیت سے متعلق بیان کے جواب میں اپنے اخبار "ہند" بابتہ ۱۲ مارچ ۳۸ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ

ہمارے مدعیان علم نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اسلام نے اسلامی سوسائٹی کا ایک ایسا نظام بنایا ہے جو ہمہ گیر اور اٹل ہے مگر یہ کہتے ہوئے ان لوگوں کو یہ یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے اس قول سے اسلام کی عالمگیری کو توڑ رہے ہیں"

یعنی انسان کے نزدیک اسلام کی عالمگیری یہ ہے کہ اسے چند عقائد کا مجموعہ تصور کر لیا جائے باقی رہا نظام سو وہ تو ایک وقتی چیز تھی جو اسلام نے عربوں کے سامنے پیش کی تھی۔ فرماتے ہیں کہ اس حقیقت سے عام طور پر چشم پوشی کیجاتی ہے کہ اسلام عربی دین ہے اسکی روح عربی ہے اور عربوں ہی نے سب سے زیادہ اس سے فائدہ اٹھایا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب

---

لہ جی ہاں۔ بالکل طاقت بشری سے باہر۔ کل ایک ایل بربہا "ہندوستانی" تھا۔ اور آج سیاسی مدبرین کی ایک جنبش قلم سے "بربی" ہوگیا (طلوع)

نہیں کہ عجمی قومیں اسلام میں داخل نہیں ہو سکتیں وہ داخل ہوئیں اور مسلمان بنیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اسلام ہے عربی دین ہی جسکی شہادتیں خود قرآن مجید میں موجود ہیں (مثلاً ؟ رازی)

---

یہ چند تصریحات محض نمونۃً پیش کی گئی ہیں ورنہ اگر ان حضرات کی تمام و کمال تحریریں آپکے سامنے ہوں تو آپ حیران رہجائیں کہ یہ کس قسم کا اسلام ہے جسے پیش کیا جا رہا ہے۔ ماحصل ان سب کے نظریوں کا یہ ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے جسکا عملی سیاسیات اور معاشی اقتصادی۔ عمرانی معاشرتی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں وہی چیز جسکا نام مولانا ابو الکلام آزاد نے "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی رکھا ہے اور جسمیں اس متحدہ قومیت کا مشترکہ مذہب بننے کی صلاحیت موجود ہے جسکی بناء بقول حضرت مولانا حسین احمد "اوطان" پر ہے یہ ہے وہ مذہب جسکی آزادی کا اعلان بھارت ماتا کے مندر کے دروازہ پر لٹکایا جائیگا اب آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ اس قسم کے مذہب کی کیا فی الواقعہ "آزادی" ہوگی۔

یاد رکھئے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے جو نظام زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ہیئت پر چھایا ہوا ہے بقول حضرت علامہ علیہ الرحمہ

اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے ..... اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے۔

اس اجمال کی تفصیل طلوع اسلام کے مسلسل مطالعہ سے آپکی نگاہوں کے سامنے آجائے گی جب تک مسلمانوں کو اس قسم کے مذہب کی آزادی حاصل ہو۔ وہ اپنے آپکو مذہبی حیثیت سے آزاد نہیں سمجھ سکتے۔ یہی وہ مذہبی آزادی ہے جسکے تحفظ کے لئے

آج مُسلمانوں کا ہر سوچنے والا دماغ غور و فکر کر رہا ہے اور اسی کا نام آج "فرقہ پرستی" رکھا جاتا ہے اور یاللعجب! کہ خود مُسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے رکھا جاتا ہے!!

از باغبان شد است کہ صیاد آن کرد

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ حقیقت آپ پر[۲] واضح ہوگئی ہوگی کہ ہمارا "قوم پرست" فرقہ اپنی پوری قوت اس نظریہ کے استحکام میں صرف کر رہا ہے کہ مذہب ایک نجی اور ذاتی عقیدہ ہے (PRIVATE AFFAIR) جماعتی زندگی سے اسے کوئی علاقہ نہیں اجتماعی زندگی سے متعلقہ معاملات سیاسی اور تمدنی مسائل ہیں جن کا حل اور تصفیہ اس نظام حکومت کی رو سے ہونا چاہیئے جو ہندوستان کی "متحدہ قومیت" پر مشتمل ہوگا۔ اسکا نام ہے سوراج۔ اس کے برعکس ہم نے ابھی ابھی چند سطور میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ ایک جماعتی مذہب ہے۔ (ORGANISED RELIGION) جسمیں دین اور دُنیا مذہب اور سیاست گرست آشرم اور سنیاس آشرم الگ الگ شعبے نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق کوئی مسئلہ ہو اور دُنیا اسے اپنی تقسیم کے اعتبار سے کسی ذیل میں لے آئے اسلام کی رو سے خالص مذہبی مسئلہ ہوتا ہے۔ اسلام کی رو سے فرد کوئی ہستی نہیں رکھتا اس لیئے اسکے انفرادی اور ذاتی اعمال بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے وہ ایک جماعت کا رکن ہے اور اسکی ہستی اس جماعت کے وجود سے ہے لہذا اسکے اعمال بھی وہی صالحہ ہیں جو اس جماعتی نظام کے اندر رہتے ہوئے کیئے جائیں "پرائیویٹ مذہب" زیادہ سے زیادہ چند اخلاقیات کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے اور یہ سطحی مجموعۂ اخلاقیات وہ ہے جو قریب قریب دُنیا کے ہر مذہب میں مشترک ہے۔ کون سا مذہب ہے جو یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو زنا نہ کرو۔ اگر مذہب اتنی ہی چیز ہے تو پھر اسلام میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی رو سے اسکا دعویٰ ہے کہ یہ خدا کا آخری دین ہے اور اس سے پیشتر کے تمام ادیان اب

اس لیئے ناقابل قبول ہیں کہ وہ اپنی اصلی شکل میں دُنیا کے پاس نہیں ہیں جو لوگ اسلام کی رُوح سے کچھ بھی واقف ہیں انھیں اس خصوصیت کا معلوم کرلینا کچھ زیادہ دشوار نہیں جس خصوصیت کی رو سے اسلام کا دعوی ہے کہ وہ خدا کا سچا دین ہے آپ اسلام کے سوا کسی مذہب کو دیکھئے وہ ایک پرائیویٹ حیثیت رکھتا ہوگا۔ وہ انفرادیت کی زندگی بسر کرنا سکھائیگا۔ ہندوؤں کے پجاری ہوں یا سنیاسی۔ عیسائیوں کے پادری ہوں یا راہب وہ "دُنیا داروں" کے طبقہ سے الگ ہونگے دُنیا داروں میں سے جو شخص "خدا پرست" ہوتا جائیگا وہ ان سے کٹ کر الگ ہوتا جائیگا۔ اسے پھر جماعتی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رہیگا۔ اسکا مطمح نگاہ پھر اپنی مکتی حاصل کرنا ہوگا۔ اسلام نے جب رہبانیت کو ناجائز قرار دیا تو اس لئے نہیں کہ لوگوں کے گیروے رنگ کے کپڑے پہننے اسے پسند نہ تھے ان کپڑوں میں کیا رکھا ہے! اسلام نے رہبانیت کی اس لئے مخالفت کی کہ رہبانیت اس نظریہ زندگی کا نام ہے جس میں انسان انفرادیت کی زندگی بسر کرتا ہے جس میں اسے صرف اپنی نجات کی فکر دامنگیر رہتی ہے جس میں دین اور دُنیا دو الگ الگ شعبے بن جاتے ہیں۔ جس میں مذہب ایک ذاتی اور پرائیویٹ عقیدہ کا نام رہ جاتا ہے۔ جس میں خدا پرستوں کے طبقہ کو اجتماعی معاملات سے کچھ علاقہ نہیں رہتا۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلام اور دیگر ادیان میں اس خصوصیت کو مٹا ڈالئے۔ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح رہ جائیگا اور اسی بنیادی فرق کے مٹا ڈالنے کا نتیجہ ہے کہ قوم پرست حضرات کا یہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ "دُنیا کے سب مذاہب سچے ہیں البتہ ان مذاہب کے بیرونی خرابیاں آگئی ہیں اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی سچائی پر عمل پیرا ہو جائیں تو پھر کسی میں کوئی فرق نہیں رہتا" تفصیل کے لیئے ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد اوّل از مولانا ابو الکلام آزاد) ہم اپنے اس دعوے کو کہ اسلام پرائیویٹ عقیدہ نہیں بلکہ ایک جماعتی مذہب ہے بتوفیق الٰہی کتاب و سنّت آثار و تاریخ سے پوری طرح ثابت کر سکتے ہیں

طلوع اسلام کا وجود ہی اس غرض کے لئے ہے لیکن اسوقت ہم اس دعوے کے اثبات میں ایک دوسری روش اختیار کریں گے۔ حصۂ اوّل میں ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ قوم پرست طبقہ کے اپنے الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ وہ مذہب کو کیا سمجھتے ہیں۔ اب ہم اس مسلم قوم پرست طبقہ کے امام مولانا آزاد کے الفاظ میں اس بات کو ثابت کریں گے کہ مذہب اسلام پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک منظم مذہب ہے جماعتی مذہب ہی فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا آزاد کی یہ تحریریں اُسوقت کی ہیں جب انھوں نے ہنوز "قوم پرستی" کا مسلک اختیار نہیں کیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۳ کا ذکر ہے کہ انجمن اسلامیہ لاہور نے ایک ریزولیشن پاس کر دیا کہ شاہی مسجد میں "سیاسی تقریریں" کرنے کی اجازت نہیں اس پر مولانا آزاد نے اپنے رسالہ الہلال میں چار بسوط اور مفصل افتتاحی مقالے تحریر فرمائے جس میں اس جوش اور ولولے کے ساتھ جو زمانہ قومیت پرستی سے پیشتر انکی نمایاں خصوصیت تھی انھوں نے کتاب و سنت سے ثابت کیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ سمجھنا کفر ہے شرک ہے جہالت ہے۔ فرماتے ہیں

میں اگر انکو کفر پرست کہوں تو تم کہو گے کہ یہ ایمان و کفر کی بحث ہی میں اگر انکو مشرک کہوں تو تم پکارو گے کہ یہ بہت ہی بڑی جسارت ہے۔ ہاں یہ جسارت ہے لیکن جن ظالموں نے اللہ کے آگے جسارت کی ہے کیوں نہ ہم بھی انکے لئے جسارت کریں۔ وہ نہ مومن ہیں نہ مسلم انکا حال یہی ہے جو کہا گیا۔ نؤمن ببعض و نکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا ان لوگوں کی اصطلاح میں جس چیز کو سیاست اور پالیٹکس کہتے ہیں اسلام کے نزدیک عین دین و مذہب ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ..... (الہلال بابت ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء ؛ ص)

اس لئے کہ۔

حضرت ختم المرسلین علیہ الصلاۃ والسلام نے تمام عالم کی ضلالتوں و تاریکیوں کو دور کرنا چاہا

اور اپنی جماعت مقدس کی زندگی اس راہ میں صرف کردی۔ یہ محض اصلاح اقوام و زمین کا کوئی خاص شعبہ نہ تھا جسکو تم نے بالکل تمدن، اخلاق اور مذہب کے نام سے تقسیم کردیا ہے بلکہ انکی دعوت عام اور انکی اصلاح عالمگیر تھی (ایضاً)

اسی زمانہ کے الہلال میں ایک سلسلہ بعنوان الحریت فی الاسلام شروع کیا گیا تھا اسکی تمہید میں تحریر کیا: اسلام خود اپنے بیان کے مطابق رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً۔ دین و دنیا کی اصلاح کیلئے آیا تھا اور اسی لئے دونوں جہان کی برکات اسکے ساتھ تھیں پھر اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اسلام کے خزانہ میں حسنات سیاست دنیاوی کا وجود نہیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ نصف خدمت انسانی کی سرانجام ہی سے وہ مقصر رہا جسکا تخیل بھی کوئی مسلمان نہیں کرسکتا...... (الہلال بابت ۲ جولائی ۱۹۱۲ء)

اس زمانہ میں مولانا صاحب نے مسلمانوں کے مصائب کا حل ایک ایسی جماعت کے قیام میں تلاش فرمایا تھا جسکا نام تھا حزب اللہ۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں انھوں نے الہلال کی متعدد اشاعتوں میں مقالات تحریر فرمائے جنمیں شروع سے اخیر تک صرف ایک چیز کو پوری قوت کیساتھ نمایاں کیا تھا کہ اسلام ایک جماعتی مذہب ہے اگر مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی مقصود ہے تو اسلام بھی مفقود ہے۔ یہ مقالات اس قابل ہیں کہ یہاں تمام و کمال نقل کیے جاتے لیکن اس سے یہ مضمون ایک کتابی شکل اختیار کرلیگا اس لئے انکے جستہ جستہ اقتباسات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"پس میں کہتا ہوں اور از فرق تا بقدم ایک صدائے ربانی بنکر کہتا ہوں جبکہ یقین کی وہ لازوال طاقت میرے ساتھ ہے جسکے لئے کبھی فنا نہیں جبکہ وہ بصیرت الہی میرے دل کے اندر موجود ہے جس میں کبھی ضلالت و تذبذب نہیں اور جبکہ وہ شہادت وحی الٰہی میرے سامنے ہے جسکی روئیت میں کبھی دھوکا اور فریب نہیں۔ کہ زندگیوں اور کامیابیوں کا وہ تخم مقدس کوئی انجمن۔ کوئی اسکیم۔ کوئی بے شمار خزانہ۔ کوئی عہد حفاظت۔ کوئی اقرار خدمت۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی آواز اور انسانوں کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی۔ مگر وہ صرف ایک ہی تحریک حق و صداقت جو مسلمانوں کو ان کی حیات (الہلال)

انفرادی وملی کی ہر شاخ میں "مسلمان" بننے کی دعوت دے۔ (الہلال ۔۔ ص ۔۔)

ہم حضرت مولانا سے باادب استفسار دریافت کرنیکی جسارت کرتے ہیں کہ آج وہ صدائے ربانی وہ یقین کی لازوال طاقت وہ بصیرت الٰہی۔ وہ شہادت القائی کیا ہوئی جو صرف اس ایک تحریک کو حق وصداقت کی تحریک قرار دیتی تھی جو مسلمانوں کی حیات انفرادی وملی کی ہر شاخ میں انھیں "مسلمان" بننے کی دعوت دے' کیا وہ تحریک یہی تحریک کانگریس ہے جو مسلمانوں کا الگ نام بھی سننا پسند نہیں کرتی اور کہتی ہے کہ مسلمان مت کہلاؤ۔ ہندی کہلاؤ۔ جو مسلمانوں کی "حیات ملی" کو تسلیم ہی نہیں کرتی اور کہتی ہے کہ ملک میں دو ہی جماعتیں ہیں ایک حکومت اور دوسری کانگریس۔ لیکن ٹھہریئے۔ خود حضرت مولانا کی زبانی ہی سنیئے کہ وہ تحریک جس کے اندر آج وہ خود شامل ہیں اور جس کی شمولیت مسلمانوں کے لئے "فریضہ مذہبی" قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کی تحریک کے متعلق اسلام کی کیا شہادت ہے۔ فرماتے ہیں۔

"پھر جب آپ ایک انجمن قائم کرتے ہیں جس کے مقاصد و اعمال کی فہرست بیسوں دفعات پر مشتمل ہے۔ لیکن نہ تو اس میں کہیں احیاء دعوت اسلامی کی دفعہ ہے نہ کہیں اسلام کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کی قید ہے۔ نہ کوئی صورت عمل وطریق کار ایسا پیش نظر ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہو اور ان کی مجاہدانہ روح عمل کو واپس لانا ہو۔ تو پھر فرمائیے۔ آپ کا مقصد تو ضروری اور آپکے کام یقیناً اچھے اور مستحق اعانت وشرکت جمیع ملین لیکن ہمارے اصلی مرض کے لئے آپنے کیا کیا اور اس کے لئے کہاں جائیں!" (الہلال بابت ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء صفحہ ۔۔)

کیا حضرت مولانا فرمائیں گے کہ کانگریس کی دفعات میں وہ کون سی دفعہ ہے جس کی رو سے احیاء دعوت اسلامی ضروری اور اسلام کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کی قید ہو۔ کانگریس کے دستور اساسی میں وہ کون سی صورت عمل اور طریق کار پیش نظر ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہو! اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر فرمائیے کہ آپ کا مقصد تو ضروری (یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا) اور آپکے کام یقیناً اچھے (یعنی ہندوستان میں ایک

متحدہ قومیت پیدا کرنا) اور مستحق اعانت و شرکت جمیع مسلمین (جسے پنڈت جواہر لال نہرو MUSLIM MASS CONTACT سے تعبیر کرتے ہیں) لیکن ہمارے اصلی مرض کے لئے تجویز کیا کیا! اور اس کے لئے کہاں جائیں!! کیا حق و صداقت کی تحریک یہی ہے جس کا نام کانگریس کا شعبۂ اسلامیات ہے۔ اور جس کے انچارج ڈاکٹر اشرف اور ایک ذمہ دار رکن جناب منظور رضوی کے خیالات ابھی ابھی پیش کئے جا چکے ہیں! مولانا! خدا کے لئے سوچئے کہ جس قسم کی تحریک کو ۱۹۱۳ء میں۔ اس حتم و یقین۔ اس بصیرت و ایقان۔ کے ساتھ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کے سامان قرار دیتے تھے۔ اُسی تحریک کو آپ آج عین کتاب و سنت" اور صراط مستقیم" قرار دے رہے ہیں کیا آج قرآن بدل گیا یا مسلمانوں کے کعبہ کی سمت تبدیل ہو گئی! اس کا جواب بھی مولانا ہی سے سنئے

"اسلام ایک آخری دین الٰہی تھا جس نے نہ صرف احکام شریعت ہی میں بلکہ حیات قومی کی ہر شاخ میں ہم کو سب سے آخر اور سب سے بہتر اصول دیدئے۔ اور دنیا خواہ کتنی ہی بدل جائے لیکن آزمایا جا سکتا ہے کہ ان اصولوں کی صداقت کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔

تکمیل دین کے لئے ضروری تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس کے پیرو اپنی تمام اصولی ضروریات میں مستغنی اور بے پرواہ ہو جائیں اور ان کو کسی نئی تلاش اور نئے اصولوں کی جستجو باقی نہ رہے

۔۔۔۔۔۔میرا عقیدہ ہے کہ آج حیات ملت و حصول عظمت ملی کے لئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں بھی "تاسیس" کی ضرورت نہیں بلکہ صرف "تجدید" کی ضرورت ہے کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے اُن کو دوبارہ زندہ کریں اور جس متاع کو حاصل کر کے گم کر دیا ہے اس کے سراغ میں پھر نکلیں۔ ہمارا جیب و دامن آج کی طرح ہمیشہ خالی نہ تھا۔ اگر آج اوروں کے پاس لعل و جواہر ہیں تو ہمارے پاس بھی اس کی کانیں تھیں۔ آج اگر ہم مفلس ہیں تو دوسروں کے لعل و جواہر کو بنظر حسرت و طمع سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو اپنی گم کردہ کانوں کے سراغ میں نکلنا چاہئے جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال تھی" (ایضاً صفحہ ۳)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی جماعتی زندگی کی تنظیم اپنی مساجد سے شروع کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی تقلیدی رنگ کی تحریک مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہو سکتی (ایضاً ص۹)

کیا ہم حضرت مولانا سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کرسکتے ہیں کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں کے لئے "تجدید" ہے یا "تاسیس"! کیا یہ تحریک مسلمانوں کی "حیات ملت اور حصول عظمت ملی" کے لئے ہی عمل میں لائی گئی ہے! کیا وہ لعل و جواہرات کی کانیں وہی تو نہیں جن کا آج اس تحریک کے علم بردار ان کھلے بندوں تمسخر و استہزاء اڑاتے ہیں! کیا وہ آپکے اٹل اور غیر تبدل اصول وہی تو نہیں جن کے مٹانے کی آرزو تحریک آزادی کے قائد اعظم کے دل میں دن رات موجزن ہے! (اس کا ثبوت ابھی آگے آئیگا)۔ کیا کانگریس میں شامل ہونے والے مسلمان "دوسروں کے لعل و جواہر کو نظر حسرت و طمع" سے نہیں دیکھ رہے! کیا اس تحریک سے آپ کو "اپنی گم کردہ کانوں کا سراغ" مل رہا ہے! کیا اس سے وہ تنظیم ملی عمل میں آرہی ہے جس کی ابتدا مساجد سے ہونی تھی!!

اللہ اکبر! انسان بھی ایک تماشہ ہے! جب اس کے مصالح اور رجحانات اس کی نگاہ کا ایک زاویہ بدل دیں تو وہ پھر کس قدر تضاد کا مجموعہ بن جاتا ہے اور کس طرح زہر کو آب حیات بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور کتنی جلدی بھول جاتا ہے کہ جب اس کی آنکھوں پر مصلحت کوشی کے رنگین چشمے نہ تھے تو سامنے کی چیزوں کے اصلی رنگ کیا تھے! یخٰدعون اللہ والذین آمنو۔ وما یخدعون الا انفسہم۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ جس چیز نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ وہ کیا تھی۔ فرماتے ہیں۔

"ایک بہت بڑی چیز جس کی ہم میں کمی ہے۔ تنظیمات عمل (آرگنائزیشن) ہے اور اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ایک مقصد مشترک سامنے ہو اور سب میں اس کے نام سے ایک رشتہ باہمی قائم ہو جائے" (ایضاً ص۶)

آج اسی تنظیمات عمل (آرگنائزیشن) کا نام ہے "فرقہ پرستی" (COMMUNALISM) جو حضرت مولانا اور دیگر "قوم پرست" حضرات کے نزدیک اتنا بڑا جرم ہے کہ جس کی معافی

نہ یہاں مل سکتی ہے نہ خدا کے حضور۔ پھر اُس وقت مقصد مشترک "حیات ملت اور عظمت ملی" تھا۔ اور آج وہ مقصد تمام اہل ہند کی ایک متحدہ قومیت" کی تشکیل ہے!

---

پھر ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ اسلام کی رو سے مسلمانوں کے لئے صحیح نظام زندگی یہ ہے کہ ان کی اپنی جماعت ہو اور اس جماعت کا مرکز اُن کا اپنا امیر ہو۔ یہی جماعتی نظام مسلمانوں کے تمام "دینی اور دنیاوی" مسائل حیات کا فیصلہ کرے۔ اسلام کسی مخلوط جماعت کا قائل ہی نہیں۔ اس کے نزدیک ایمان اور کفر دو مستقل بالذات الگ الگ نظریۂ زندگی ہیں جن میں باہمی امتزاج ہو ہی نہیں سکتا۔ اب دیکھئے کہ حضرت مولانا کا اس اپنی جماعت کے متعلق کیا خیال تھا۔ ذرا غور سے سنئے۔ فرماتے ہیں:

> اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت" رکھا ہے، اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور "حیات جاہلی" سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ آگے تفصیل آئے گا۔ (مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب از مولانا آزاد)

اس کے بعد حضرت مولانا نے متعدد احادیث سے ثابت کیا ہے کہ جو شخص اپنی جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا سیدھا جہنم میں پہنچا۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

> "قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے۔ اور فرد کا وجود اور اعمال بھی اس لئے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو۔" (ایضاً)۔

اس سے ذرا آگے ہے۔

> "اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے...... سو ان تمام تصریحات میں بھی اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے۔ دیوار کا نام ہے۔" (ایضاً)۔

کیا حضرت مولانا اتنا ارشاد فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ مسلمانوں کی اس اجتماعی زندگی کا تصور آج کہاں چلا گیا! ان کی الگ جماعت کے اسلامی نظریہ کو آج کیا ہوا! یہ اسلامی "متحدہ قومیت" آج ہندی "متحدہ قومیت" سے کس طرح بدل گئی کہ جس کی اساس اسلام پر نہیں بلکہ وطن پر رکھی جارہی ہے! یہ اجتماع کی بجائے افراد کی الگ الگ زندگی۔ جو کل تک قرآن و سنت کی رو سے "جاہلیت" کی زندگی تھی۔ آج کس طرح عین اسلامی زندگی بن گئی! یہ اسلامی "اینٹیں" کہ جنہیں باہمی اتحاد و ائتلاف کے سیمنٹ سے مل کر ایک ایسی مستحکم دیوار۔ ایک ایسی بنیان مرصوص" بننا تھا جو کفر کی ہر بڑھتی ہوئی رَو کا مقابلہ کر سکے۔ آج یہی اینٹیں۔ ایک ایک کر کے اُس دیوار میں کیوں چنی جارہی ہیں کہ جس کی بنیاد دیکھی گئی غیر اسلامی ہے! کیا حضرت مولانا۔ معہ اپنے تمام رفقاء کار کے۔ کوئی ایک آیت۔ کوئی ایک حدیث ایسی پیش کر سکتے ہیں جس میں یہ لکھا ہو کہ ملّت اسلامیہ کی یہ اینٹیں۔ کسی دوسری ملّت کی اینٹوں کے ساتھ ملکر ایک مخلوط دیوار بھی قائم کر سکتی ہیں! اس میں شبہ نہیں کہ ہم حضرت مولانا۔ یا اُن کے دوسرے ہم مسلک مسلم قوم پرست حضرات کو کسی طرح بھی مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ان استفسارات کا جواب دیں۔ لیکن اگر انہیں ذرا سا بھی احساس ہے کہ قرآن و سنت کا بھی بالآخر کوئی حق ان پر واجب آتا ہے تو خدا کے لئے اپنی اس بے پناہ خاموشی کی مہر کو توڑیں اور ایک مرتبہ اتنا تو بتا دیں کہ اس تبدیلیٔ مسلک کی تائید میں کون سی سند ان کے پاس ہے! اس مسلک کی تبدیلی کے جواز میں جس کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ۔

"احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں۔ اور عہد صحابہ سے لیکر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ و حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کرونگا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم۔ انی آمرکم بخمس اللہ امرنی بھن۔ الجماعۃ۔ والسمع۔ والطاعۃ۔ والھجرۃ۔ والجھاد فی سبیل اللہ۔ انہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع۔ ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من جھنم۔ قالوا یا رسول اللہ وان صام وان صلی۔ قال وان صلی وصام وزعم انہ مسلم۔

یعنی فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کے لئے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے آج دیا ہے۔ جماعت - طاعت - ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد - یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بیقیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور!) کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا خواہ وہ نماز پڑھتا ہو۔ اور روزہ رکھتا ہو! فرمایا۔ ہاں۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو۔ اور روزہ رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو“

اس کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

”پہلی چیز جماعت ہے۔ یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کر رہنا چاہئے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہئے۔ آگے چل کر شہرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی جماعت ہے“ (ایضاً)

کیا حضرت مولانا کبھی رات کی تنہائیوں میں۔ دماغی مصلحت کوشیوں کو یکسر الگ رکھ کر۔ اتنا سوچیں گے کہ آج جس روش پر وہ خود گامزن ہیں اور جس پر چلنے کی وہ مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ وہ اُن کے اپنے ہی الفاظ میں کس قسم کی روش ہے! مسلمانوں کا اپنی جماعت کی تنظیم کرنا۔ اُن کا اپنے

مرکز قومی سے جڑ کر رہنا۔ یہ اسلامی زندگی ہے۔ یا ان کا ایک ایک کرکے ایک ایسی مخلوط جماعت میں جاکر جذب ہوتے جانا جس کے عناصر ترکیبی میں کوئی عنصر بھی اسلامی نہیں! کیا یہی مسلمانوں کا "اپنا مرکز قومی" ہے! ہم جانتے ہیں کہ آج بیچاری کمزور رہنا توان ملّت اسلامیہ کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ ان حضرات کی مہر سکوت کو توڑ سکے۔ لیکن بالآخر ایک دن ایسا بھی تو آنے والا ہے جبکہ زبانیں خاموش ہونگی لیکن جسم کا ایک ایک حصّہ گواہی دیگا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا! یہ قرآن و سنّت کی تصریحات ہم اپنی طرف سے نہیں پیش کر رہے۔ یہ تو خود انہی حضرات کی پیش فرمودہ ہیں! کیا آپ سمجھتے ہیں ان سے قطعاً اس چیز کی باز پرس نہ ہوگی کہ ان تمام تصریحات کو خود ہی بیان کرنے کے بعد تم لوگ کس راستے پر چل پڑے اور دوسرے لوگ اس خیال سے کہ تم قرآن و سنّت کے جاننے والے ہو۔ تمہارے تتبع میں تمہارے پیچھے ہو لئے"۔ کیا ان سب کی ذمہ داری بھی انہی پر عائد نہ ہوگی۔ ذرا قرآن کریم کو کھول کر دیکھئے کہ اس باب میں احکم الحاکمین کا کیا فیصلہ ہے؛ نہیں انہی حضرات کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں۔

"پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا۔ گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو۔ اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو" (ایضاً)

ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کہ یہ ان حضرات کی شان میں سوء ادبی ہو جائیگی۔ جب خدا اور اس کا رسول ؐ یہ کچھ فیصلہ کر رہا ہو تو ہمیں کسی اضافہ کی کیا ضرورت ہے؟ اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ مسلمانوں کے لئے "راہ عمل" کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کیلئے "راہ عمل" ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں۔ جس میں وہ

ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہوگئے ہیں۔ جماعتی زندگی کی معصیت سے مقصود یہ ہے کہ ان میں "ایک جماعت" بنکر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہوگیا ہے۔ وہ بالکل اُس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہوکر گم ہوگیا ہو۔" (ایضاً)

ایسی غیر اسلامی زندگی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

"قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کردیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (دینی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے، اور پوری قوم کی قوم تباہ ہوجاتی ہے۔" (ایضاً)

ہمیں بالعموم بتایا یہ جاتا ہے کہ صاحب! مسلمانانِ ہند کے سامنے دو چیزیں ہیں۔ ایک تو اپنی جماعتی تنظیم اور دوسرا ہندوستان سے انگریزوں کا نکال دینا۔ چونکہ انگریزوں کی غلامی بہت بڑی لعنت ہے اس لئے مقدم یہ مسئلہ ہے۔ جب یہ حل ہوجائیگا تو پھر مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا سوال ہاتھ میں لے لیا جائیگا۔ آج یہ دلیل دی جاتی ہے اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ دلیل بڑی محکم ہے۔ لیکن۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ خود حضرت مولانا کو اقرار ہے کہ جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے۔ اور پوری قوم کی قوم تباہ ہوجاتی ہے اب غور فرمائیے کہ مقدم جماعتی زندگی کی تنظیم ہوئی یا انگریزوں کا ہندوستان سے نکالنا۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ کانگریس کے ساتھ مل کر آپ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوجائیں گے۔ لیکن جب آپ آزاد ہونگے تو اُس وقت ملت اسلامیہ کہاں ہوگی! وہ تخم ہلاکت جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے "پوری قوم کی قوم" تباہ کرچکا ہوگا۔ اُس وقت کی آزادی سے آپ کو خوشی کیا ہوگی! پچھلے دنوں لندن کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے ایک معرکۃ الآرا اپریشن کیا۔ اپریشن بڑا نازک تھا۔ تمام دنیا کے اہل فن حضرات کی آنکھیں نتیجہ کی طرف لگ رہی تھیں۔ وہ اپریشن سے فارغ ہوا تو ساری دنیا میں مسرت کے تار دوڑ گئے

کہ اپریشن بڑا کامیاب رہا۔ نہایت صفائی سے نازک ترین مراحل طے ہوگئے۔ البتہ صرف اتنا ہوا کہ مریض چل بسا۔ اسی قسم کے اپریشن میں یہ حضرات مصروف ہیں اور پھر متمنی ہیں کہ قوم ان کی خدمات جلیلہ کی شکرگذار رہو۔ کیا ان حضرات کو اتنا بھی علم نہیں کہ انگریزوں کی غلامی میں مسلمان اسی لئے آگئے تھے کہ ان میں جماعتی زندگی کا فقدان ہوچکا تھا۔ اور اب "مسلمان" غلامی سے نکل بھی اسی وقت سکیں گے جب ان میں نظام جماعتی پیدا ہوگا۔ "ہندوستان کی آزادی" اور "مسلمانوں کی زندگی" مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ اس لئے کہ جس تشتت وافتراق۔ جس "جماعتی زندگی کی معصیت" کے دور سے مسلمان آج گذر رہے ہیں۔ اس کا تولازمی نتیجہ بقول حضرت مولانا۔ پوری کی پوری قوم کی تباہی ہے۔ جب قوم ہی نہ ہوگی تو آزاد کون ہوگا! مسلمانوں کی آزادی کا مفہوم تو یہ ہے جو خود حضرت مولانا نے اپنے مسلک قومیت پرستی سے پیشتر ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔

> "اسلام میں حق امر و حکم کسی کو نہیں۔ وہ دنیوی انتظام و حکومت میں جب کسی ایک فرد کے استبداد کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ "ان الحکم الا للہ" تو اس کے احکام دینیہ کیونکر تابع آراء اشخاص و جماعت مخصوصہ ہو سکتے ہیں! اس نے یہ حق صرف قرآن کو دیا ہے۔ یا پھر دنیوی امور میں اس اجماع کو جو تمام مسلمانوں کی اکثریت رائے سے عبارت ہے" (الہلال۔ ۸ راکتوبر ۱۹۱۳ء)
>
> اور اسی کا نام ہے "اسلامی نظام اجتماعی"

---

(۳)

یہاں پہنچکر آپ کے دل میں فطرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب حضرت مولانا کے نزدیک چند سال اُدھر۔ اسلام نام ہی اس چیز کا تھا کہ مسلمانوں کی الگ جماعت ہو۔ ان کی اپنی متحدہ قومیت ہو۔ ان کا اپنا مرکز ہو۔ ان کے تمام معاملات اس نظام کی رو سے طے پائیں جو خاص قرآن وسنت کی روشنی میں ان کی اپنی اکثریت کی رو سے وجود میں آئے۔ ان کے لئے کوئی ایسی

تحریک جوان کی احیائے ملّی کے لئے عمل میں نہ آئی ہو۔ کبھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتی خواہ اس کے مقاصد کتنے ہی دلکش کیوں نہ ہوں۔ کوئی ایسی تحریک جوان کو انفرادی اور ملّی حیات کے ہر شعبہ میں "مسلمان" بننے کی دعوت نہ دیتی ہو۔ کبھی حق و صداقت کی تحریک نہیں ہوسکتی۔ جب حضرت مولانا کا ایقان اور ایمان یہ تھا۔ تو پھر آج یہ کیا ہوا کہ اُن کے نزدیک یہ تمام اصول مردود قرار پاگئے۔ اور انکی جگہ ایک ایسے مسلک نے لے لی جس کی رو سے ان اصولوں کا نام تک لینا بھی جرم قرار پاگیا۔ اس کا جواب شاید آپ کو نہ مل سکے۔ لیکن آیئے ہم آپ کو تھوڑا سا سراغ دیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ کے قائل ہیں۔ سو قرآن کریم کی وہ آیات جنکی رو سے وہ پہلے اصول اسلامی ثابت کیا کرتے تھے بعد میں منسوخ ہوگئے۔ لیکن یہاں پھر یہ مشکل آپڑے گی کہ منسوخ آیات کا تو آپ کو پتہ مل جائیگا۔ لیکن یہ پتہ نہیں مل سکیگا کہ ناسخ آیات کون سی ہیں۔ اس لئے کہ جنسے حضرت مولانا نے یہ نیا مسلک اختیار فرمایا ہے۔ اس مسلک کی تائید میں آج تک کوئی آیت و حدیث پیش نہیں کی۔ لہذا یہ ناسخ آیات آپ کو قرآن کریم میں نہیں ملیں گی۔ بلکہ ان ناسخ احکام کا ماخذ کچھ اور ہے ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

اصولی چیز تو یہی ہے تا کہ مسلمانوں کی الگ جماعت اور اپنی متحدہ قومیت ہونی چاہئے۔ اسکے متعلق ارشاد ہے۔

> ہندوستان میں **مسلم قومیت** پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے۔ جو یکجا نہیں منتشر ہے۔ مبہم ہے اور غیر متیقن ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جاسکتا ہے ...... **مسلم قومیت** کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس **مذہبی اخوت** کا رشتہ ہی ایک چیز ہے اس لئے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشوونما نہ پاسکے؟"
>
> (میری کہانی۔ از پنڈت جواہر لعل نہرو۔ جلد دوم ص ۳۳۱)

آیا آپ کے خیال میں کہ "مسلم قومیت" کا نظریہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات کے نزدیک "لغو" کیوں قرار پاگیا اور آگے بڑھیے۔ ارشاد ہے۔

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے

(خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۶ء۔ از پنڈت جواہر لعل نہرو)

کس قدر حسرت اور کتنا استعجاب ٹپکتا ہے اس فقرہ سے کہ "ابھی تک ایسے لوگ زندہ ہیں"۔ گویا ان کے نزدیک زندہ رہنے کا حق صرف انہی کو ہونا چاہئے جو اس دقیانوسی خیال سے توبہ کرکے ان کی ہمنوائی میں فتوے صادر کردیں کہ مسلمان کوئی الگ قوم و ملت نہیں ہے۔ آج قومیت کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ اوطان پر رکھی جاتی ہے۔

"مسلم قومیت" کا تصور۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک منظم مذہب (ORGANISED RELIGION) ہے۔ اور یہی خصوصیت ہے جو اسلام کو دیگر ادیان سے متمیز کرتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے قوم پرست حضرات مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ قرار دیتے ہیں اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات نے یہ نظریہ کہاں سے لیا ہے۔

پنڈت جی ارشاد فرماتے ہیں۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹادینے کی آرزو تک کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین۔ اور ترقی دشمن کا۔ بے دلیل عقیدت اور تعصب کا۔ توہم پرستی اور

لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق آنیوالوں کی بقا کا حامی ہے۔" (میری کہانی ص ۱۶۱)

غور فرمایا آپ نے کہ یہ "منظم مذہب" کو مٹانے کی آرزو کہاں سے پیدا ہوئی ہے۔ اور چونکہ "منظم مذہب" دنیا میں صرف اسلام ہی ہے اس لئے بالفاظ دیگر "اسلام کو مٹانے" کی وہ آرزو کہاں سے پیدا ہو رہی ہے جس کی تائید ہمارے مسلم قوم پرست حضرات کر رہے ہیں۔ اور آگے پڑھئے۔ ارشاد ہے۔

"منظم مذہب بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بنکر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔" (ص ۱۶۷)

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ وہی مقصد اسلامی جسے حضرت مولانا "احیائے ملّی" سے تعبیر فرماتے تھے اب ایک ایسے گھناؤنے جذبہ کا نام ہو گیا جسے مستقل اغراض سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور اس نظریہ کو "ترقی" کا دشمن کہا جاتا ہے۔ گویا ترقی یہ ہے کہ "منظم مذہب" اسلامی جماعتی نظام کا وجود دنیا میں نہ رہے۔

وہی "مسلم قومیت" جس کے متعلق حضرت مولانا پورے ایقان و بصیرت سے فرماتے تھے کہ عین اسلام ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔ اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔" (ایضاً ص ۳۳۲)

اُمید ہے کہ حضرت مولانا نے سابق صدر کانگریس سے ضرور معافی مانگ لی ہوگی۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس "مسلم قومیت" کے تخیل کی اشاعت کے زیادہ تر یہی ذمہ دار تھے۔

---

مضمون بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس لئے ہم سردست اتنے ہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ابھی سے آپنے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات نے جو اپنا رُخ "کعبہ" سے پھیر کر "ترکستان" کی طرف کر لیا ہے وہ کس "قبلہ نما" کی سوئی کے رُخ کو دیکھ کر کیا ہے۔ تاسف صرف اس چیز کو دیکھکر ہوتا ہے کہ میلانات و عواطف انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ وہی مولانا آزاد جو لاہور کی انجمن کے ایک ریزولیشن کو دیکھکر سراپا آگ ہو جاتے تھے اب کچھ ایسے بیٹھے ہیں کہ یہ تمام چیزیں اپنی آنکھوں سے پڑھ رہے ہیں۔ اسلامی محکمات کا یوں تمسخر اڑتا دیکھ رہے ہیں۔ اور ایک لفظ احتجاج کا نہ اُن کی زبان سے نکل سکتا ہے نہ قلم سے۔ اور اسی پر اکتفا نہیں۔ بلکہ وہ تمام مسلمانانِ ہند کو عملاً بتا رہے ہیں کہ وہ راستہ جو اس کانگریس کا تجویز فرمودہ ہے جس کے قائد اعظم کے خیالات آپنے ملاحظہ فرمائے ہیں وہی راستہ دین کی "صراطِ مستقیم" ہے۔ اور اس کے علاوہ جو بھی راستہ ہے۔ باطل کا راستہ ہے۔ اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ ہمارے دُکھے ہوئے دل کی آہیں۔ سر مدِ مرحوم کی ایک رباعی کی شکل میں حضرت مولانا اور ان کے دیگر ہم مسلک علمائے کرام کی خدمت میں شرفِ پذیرائی حاصل کریں۔ ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں

سرشورِ دین را عجب شکستے کردی　　ایماں بہ فدائے چشم مستے کردی

باعجز و نیاز جملہ نقد خود را　　رفتی و نثار بت پرستے کردی

---

یہ چیز تو آپنے دیکھ ہی لی کہ اسلام کی رو سے مسلمانوں کی اپنی الگ جماعت۔ اپنا مرکز اور اپنا نظام ملی ہونا اسلام ہے۔ یہ نہیں ہے۔ تو اسلام بھی نہیں ہے۔ ایسے سوال یہ پیدا ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعت کا ملک کی دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کیسے ہوگا! ملک کی ترقی اور بہبودی کے لئے یہ کس شکل میں ان سے تعاون کر سکیں گے۔ ایسی مخلوط آبادی میں یہ اپنے نظامِ ملی کو کس صورت میں قائم رکھ سکیں گے! انشاءاللہ ان تمام سوالات کے جواب ہم کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرینگے۔ اور نہایت واضح طریق سے پیش کرینگے۔ لیکن اس وقت آپ پورے اطمینان و یقین کے ساتھ اس اساسی اور بنیادی چیز کو سمجھ لیجئے کہ اسلام نام ہے مسلمانوں کی اپنی الگ جماعت کا۔ اپنے مرکز کا اور اپنے نظامِ ملی کا۔ یہ اصول ہے۔ باقی تمام مسائل فروعات ہیں۔ فروعات کا حل ہمیشہ اصول کی روشنی میں تلاش کیا جاتا ہے۔ اصول گم کر کے فروعات کے حل تلاش کرتے پھرنا ایسا ہی ہے جیسا اس جسم کے پھوڑے پھنسیوں کا علاج کرنا جس جسم سے سر کٹ کر الگ ہو چکا ہو۔ وفیہا آیات لقوم یعقلون۔

# حیات

## پرسیدم از بلند نگہے حیات چیست؟

(از جناب سید بشیرالدین احمد صاحب بی اے ارکونم)

انسان کو ثبات کی طلب ہے اور وہ اس دنیا میں ہمیشہ سے کسی نہ کسی دستور حیات کا طالب رہا ہے، دنیا کے مختلف مذہبوں اور مفکروں نے حیات کے مختلف نظریے پیش کیے ہیں، جن سے وہ بلا واسطہ اور بالواسطہ متاثر ہوا ہے۔ اُس کے آگے دو راستے کھلے ہیں۔ (۱) دانش نورانی ــــ وحی والہام کا راستہ اور (۲) دانش برہانی [1] ــ فلسفہ کا راستہ۔ مولانا جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے مسجد فاتح سلطان محمدؒ، ترکی کی تاریخی تقریر میں نظام عالم کو ایک زندہ جسم، مختلف اعضا کو پیشوں، دماغ کو بادشاہ اور دل کو فلسفہ یا وحی سے مناسبت دی تھی، اور اُس کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ پیغمبری خدا کی دین ہے، اور فلسفہ اکتسابی چیز ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ علماء نے اپنی مخصوص کج نگاہی سے کام لیکر اس تقریر کی کیا کیا غلط تاویلیں کھینچ نکالی تھیں، ہمیں یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیے کہ فلسفہ عقل کی معیت میں چلتا ہے اور یہ راستہ اسقدر پر پیچ در پیچ ہے کہ کبھی ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ علاوہ برین وحی اور

---

[1] "دانش نورانی" بھی دلائل و براہین کی بنا پر ہی دعوت دیتی ہے البتہ اُسکے دلائل و براہین یقین پر مبنی ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی طرح ظن وقیاس پر نہیں۔ وہ فلسفہ جس کا ماخذ قرآن ہو خود "دانش نورانی" کے ذیل میں آجاتا ہے۔ سید صاحب کا بھی غالباً یہی مفہوم ہے۔ طلوع اسلام

وحی میں فرق ہے اور اسی طرح فلسفہ اور فلسفے میں فرق ہے ایک وحی وہ ہے جو آزادی و آفاق گیری کے لیے نوع انسانی کو تیار کرتی ہے، اور ایک وہ ہے جو علانیہ محکومی و غلامی کی تبلیغ کرتی ہے ایک فلسفہ وہ ہے جو حقایق زندگی پر نظر رکھتا ہے، اور ایک وہ ہے جو موت کو اپنا مقصود و نگاہ قرار دیتا ہے، ہماری زبان کے زندۂ جاوید شاعر حضرت اکبر مرحوم کا شعر ہے ؎

ایک فلسفہ ہے تیغ کا اور اک سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے بس عنکبوت کا

تارِ عنکبوت قابلِ التفات نہیں زمانہ ہمیشہ سے اس امر کا طالب رہا ہے کہ اقوام تیغ یا سکوت مین سے کسی ایک کا اپنے لیے انتخاب کرلیں، اور اب مسلمانوں کے آگے یہی مسئلہ درپیش ہے کہ وہ اغیار سے تیغ تازی کا لوہا منوائیں اور وہ اپنی زندگی برقرار رکھیں یا پھر سکوت اختیار کرلیں اور اقلیم جیون کی بہشت کے عوض اپنی زندگی اغیار کے ہاتھوں فروخت کردیں، فلسفۂ سکوت کو لیجیے، مشرقی اور خصوصاً عجمی ادب و شعر پر اس فلسفے نے کافی سے زیادہ اثر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی شاعر یا ادیب جب آنکھ کھولتا ہے تو اُسے ہر چہار جانب موت ہی نظر آتی ہے، اور تباہی و بربادی جو ہمیشہ اُسکے سر پر منڈلاتی رہتی ہے اُس کی ہر خواہش کو پیدا ہوتے ہی ہڑپ کرجاتی ہے چنانچہ یہ بے چارہ حکیمانہ انداز میں دُنیا سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کی نصیحت کرتا ہے اور مرگ آرزو کی نوحہ خوانی میں اپنی عمر صرف کردیتا ہے۔ مثلاً شاپور طہرانی نالہ کناں ہے

جز غصۂ فلک حوالۂ ما نکند   جز لخت جگر نوالۂ ما نکند
یک جرعہ بما نمی دہد ساقیٔ دہر   تا خوں بدل پیالۂ ما نکند

خواجہ حافظ تلقین کرتے ہیں۔

رموز مملکت خویش خسروان دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اور پھر دُنیا سے کنارہ کشی کی یوں تاویل کرتے ہیں۔

دلا در جہان دل منہ زینہار ۔۔۔ کہ کس بر سر پل نہ گیرد قرار
ہماں مرحلہ است این بیابان دور ۔۔۔ کہ گم شد درو لشکر سلم و تور
کجا رائے پیران لشکر کشش ۔۔۔ کجا شیدۂ ترک خنجر کشش
نہ تنہا شد ایوان دکاخش بباد ۔۔۔ کہ خاکش ندارد کسے ہم بباد

ہماری زبان کے مشہور صوفی شاعر خواجہ میر درد فرماتے ہیں

باید کہ ز فکر زندگانی گذری ۔۔۔ وز حرص ہوائے کامرانی گذری
اے درد ز اندیشۂ عالم بگذر ۔۔۔ زاں پیش کہ زین جہان فانی گذری

شاہ رکن الدین محمود سنجانی نے تو غضب ہی کر دیا ہے ؎

مردان خدا میل بہ ہستی نہ کنند ۔۔۔ خود بینی و خویشتن پرستی نہ کنند
آنجا کہ مجردان حق می نوشند ۔۔۔ خم خانہ تہی کنند و مستی نہ کنند
در راہ چنان رو کہ سلامت نہ کنند ۔۔۔ با خلق چنان زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چنان رو کہ ترا ۔۔۔ در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند

شہنشاہ جہانگیر کو شاید شاعروں کی صف میں نہیں لایا جا سکتا لیکن ذیل کی رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی روحانیت زندگی کو کس نگاہ سے دیکھتی ہے۔

اے آنکہ غم زمانہ پاکت خوردہ ۔۔۔ اندوہ دل و سوسہ ناکت خوردہ
مانندِ قطرہ ہائے باراں بزمیں ۔۔۔ جا گرم نہ کردہ کہ خاکت خوردہ

اسی طرح دارا شکوہ کا یہ شعر کہ ؎

با دوست رسیدیم چو از خویش گذشتیم ۔۔۔ از خویش گذشتن چہ مبارک سفرے بود

اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اُسکے دل و دماغ پر گوسفندانہ افلاطونیت کا کس قدر اثر تھا۔

بعض عربی شعراء کے متعلق ڈاکٹر دی بوئر رقمطراز ہے۔

"بدقسمتی[1] سے ابوالعتاہیہ اپنی شیریں بیان شاعری میں قریب قریب ہمیشہ ناکام محبت اور آرزوئے مرگ کا ذکر کرتا ہے وہ اپنی حکمت کا اظہار اس شعر میں کرتا ہے۔

عقل کو شک کی پیروی کرنے دو

گناہ سے بچنے کی سب سے بہتر تدبیر ترکِ تعلقات ہے! جس شخص کو مسائل زندگی اور فطری شاعری سے ذرا بھی مناسبت ہے، اسے اس شاعری میں جو دُنیا کے زوال پر آنسو بہاتی ہے اتنی ہی بے لطفی ہوگی جتنی متنبی کے کلام سے متنبی کے اشعار صوری حیثیت سے دل کش ہیں مگر معنوی حیثیت سے بالکل پھیکے۔ اسی طرح ابوالعلا معری کو فلسفی شاعر کی حیثیت سے اُسکے استحقاق سے بڑھ کر جگہ دی جاتی ہے۔ نہ تو اُسکے خیالات جن میں سے بعض معقول اور قابلِ قدر بھی ہیں، کو فلسفہ کہہ سکتے ہیں اور نہ اُسکے عامیانہ طرزِ ادا کو شاعری۔ (وہ اندھا اور مفلس تھا تو) ماہرِ لسانیات یا مؤرخ کی حیثیت سے ادنیٰ درجے کی تنقید میں وہ کچھ کر سکتا تھا لیکن اُسے سُوجھی کیا کہ بجائے ولولۂ حیات اور جوشِ عمل کی رُوح پھونکنے کے وہ ترکِ دُنیا کا وعظ کہنے لگا"۔

ادبی شاعری کے اس فرسودہ حصّے کا اگر زندہ و محرک حصّے سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پستی و بلندی اور تاریکی و روشنی میں کیا فرق ہے۔ معاملہ شناس شیخ[2] یہ دانشمندی کی تعلیم ان الفاظ میں دیتا ہے:۔

"بجائے اسکے کہ دوسرے تجھے دق کریں،

تو دوسروں کو دق کر.........

اگر باز تیرے ہاتھ سے نکل جائے

تو کنجشک ہی کو غنیمت جان

---

[1] فلسفہ اسلام مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین [2] فلسفۂ اسلام مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین

اگر دینار نہ ملے۔

تو درہم ہی پر قناعت کرے،

خیام و حافظ کی قبیل کے شعراء کی شب پرستی و سرپذیری کے مولانائے روم اپنی حق پرستی و سربلندی کا مقابلہ بدیں الفاظ کرتے ہیں :-

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اور جہاں دوسرے شعراء مرگِ آرزو کی مرثیہ خوانی اور ترک علائق کی تلقین و تبلیغ میں مصروف ہیں، وہاں مولانا کس بلند آہنگی سے فرماتے ہیں،

زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت　　شیرِ خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما　　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

حضرت نظامی گنجوی علیہ الرحمہ نے ذیل کے شعر میں گویا مجاہدانہ روح کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے :-

چوں شیران بہ سر پنجہ بکشائے چنگ　　بہ خورد بہ مے یالائے خود را بہ رنگ

اور اُنکے اس شعر کی داد ـــــ

من آنکہ عنان باز پیچم ز راہ　　کہ یا سر دہم یا ستانم کلاہ،

کچھ ٹیپو سلطان شہیدؒ صلاح الدینؒ اور نپولین جیسے دل و دماغ ہی دے سکتے ہیں۔

ایک شاعر شہید طہرانی اعتراف کرتا ہے کہ اُسنے سر پیٹنے کی بیہودگی سے اپنے ہاتھوں کو اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ کوئی مفید کام کر سکیں۔

بیہودہ دست بر سر خود عمرہا زدم　　کارے ز دست ناید و دستم ز کار ماند

بعینہٖ یہی حال ان تمام لوگوں کا ہے جو قنوطی نقطۂ نگاہ سے زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور اسکے برعکس ان لوگوں کی حالت ہے جو درد سے درمان کا کام لیتے ہیں اور چمن میں زندگی بسر کرنے کے لیئے خار آشنائی کے گُر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ٭

درد سے درمان کا کام کس طرح لیا جاتا ہے، اس کی ایک مثال ہمیں شوپنہار اور نیٹشے کے فلسفے کے موازنہ سے مل سکتی ہے۔ دونوں کا فلسفہ "ارادیت" (Voluntarism) سے تعلق رکھتا ہے، اور دونوں حقیقت یا منتہیٰ (Ultimate Reality) کو عزم یا ارادے (Will) سے تعبیر کرتے ہیں۔ آگے چلکر شوپنہار ارادے کو ایک غیر عقلی ارادۂ عامہ (Individual Will) قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اُسکے نزدیک ارادۂ شخصی (Individual Will) کوئی چیز نہیں کیونکہ فردیت محض التباس ہے۔ زندگی ناتمام آرزوؤں کی ایک دُکھ بھری کہانی ہے؛ اور بہتر یہی ہے کہ انسان کوئی آرزو ہی نہ کرے التباسِ فردیت اور آرزوؤں کے دردناک انجام کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھے اور زندگی کو فن کا ایک کارنامہ تصور کرے۔ شوپنہار کے برعکس نیٹشے ارادے کو خواہش اقتدار یا عزم للقوۃ (Will To Power) قرار دیتا ہے۔ آگے چلکر وہ شوپنہار سے اتفاق کرتا ہے کہ واقعی دنیا آلام و مصائب کے بندھنوں میں اُلجھ گئی ہے لیکن اُسکے نزدیک یہ مرض لاعلاج نہیں۔ وہ تجرد اور قنوطی زندگی کے خلاف جدّ وجہد اور پُرخطر اور بہادرانہ زندگی کی تعلیم دیتا ہے، کیونکہ جہد للبقار فوق البشر انسانوں کو سطح کار پر لاتی ہے، جو ساری مشکلات کا حل ہیں لیکن نیٹشے چونکہ منکر خدا ہے اس کی نظر محدود رہ گئی ہے اسکا ذرجیون فوق البشر کے ظہور کے لیے اعلیٰ و ادنیٰ انسانوں کی تفریق روا رکھتا ہے اور وہ فوق البشر کو ابدی تکرار (Eternal Recurrence) کے چکر میں اُلجھا دیتا ہے، بہرحال نیٹشے کی تعلیمات نے یورپ کی سرد مسیحی دُنیا میں ایک آتشین ذہنی انقلاب برپا کیا جو (یہ کہنا بے جا نہ ہوگا) بڑی حد تک نفسیاتِ آمریت کا ذمہ دار ہے۔

"زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دُنیا خارجی وجود اختیار نہیں کرسکتی جب تک کہ اُسکا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو

قرآن مجید نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ (دیباچہ پیامِ مشرق) سوال یہ ہے کہ ایک نئی خارجی دُنیا کی تشکیل کن اُصولات پر کیجائے، یہ کام کون کرے، اور پھر اسکا وجود عوام کے ذہن میں کس طرح متشکل کیا جائے؟ وحی اصولات کا تعین کرتی ہے اور فلسفہ فروعات کی تعمیر و ترتیب میں مدد دیتا ہے! اور اس لحاظ سے صحیح وحی کے ساتھ نوعِ انسانی کو صحیح فلسفہ کی بھی ضرورت ہے۔ غرض ایک دیدہ ور فلسفی ہی جسکا فلسفہ ادب خوردۂ دل، ہو، اس کی تشکیل میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور ایک بلند پایہ شاعر جیسکے دلی جذبات اور دماغی افکار میں توازن ہو، اسکا وجود ضمیر انسانی میں مؤثر طور پر متشکل کر سکتا ہے۔ کسی قوم کی یہ بڑی خوش قسمتی ہوگی، اگر کسی شخصیت میں شاعر اور فلسفی کی یہ دونوں صفتیں بیک وقت موجود ہوں، ہمارے درمیان اس کی روشن ترین مثال قبلہ علامہ اقبالؔ ہیں +

اقبالؔ کے نزدیک خودی کی فاعلیت کا نام حیات ہے، جسکا راز پیہم نئی آرزوئیں پیدا کرنے اور اُنکی تکمیل کے لیے ادراک و حواس کی بدولت مادے کی مزاحمات و مشکلات پر عبور حاصل کرنے میں مضمر ہے۔ دوسرے الفاظ میں، یہ فاعلیت ایک مسلسل جدوجہد ہے، جس کی بدولت خودی کو توانائی و تنومندی حاصل ہوتی ہے

دمادم رواں ہے یمِ زندگی + ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود + کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل + خوش آئی اُسے محنتِ آب و گل

---

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی		فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

---

ص۱ یہ مضمون ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کے محشر انگیز حادثہ سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ طلوع اسلام

بہت اُس نے دیکھے ہیں پست و بلند سفر اسکو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
اُلجھ کر سلجھنے میں لذت اُسے تڑپنے پھڑکنے میں راحت اُسے

---

درسرائے ہست و بود آئی؟ میا ازعدم سوئے وجود آئی؟ بیا
دربیابانے چوں شرر آوارہ شو درتلاشِ خرمنے آوارہ شو

چونکہ مادے پر عبور حاصل کرنے کے لیے ہمت و پامردی اور پُرخطر زندگی کی ضرورت ہے، شاعر مختلف انداز سے اسکی ترغیب دلاتا ہے۔

پرسیدم از بلند نگہے حیات چیست؟ گفتا مے کہ تلخ تر او نکوتر است

---

چمن خوش است ولیکن چو غنچہ نتواں زیست قبائے زندگیش از دمِ صبا چاک است
بہ خود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی چوں خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

---

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

---

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟ یک دمِ شیری بہ از صد سالہ میش

---

خودی کی حالت جد و جہد برقرار رکھنے (یعنی حیات ہی) میں، خودی کی تربیت اور بقائے شخصی کا راز پنہاں ہے ایک تربیت یافتہ خودی ہی بقائے شخصی کی مستحق ہو سکتی ہے کیونکہ غیر تربیت اور کمزور خودی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرسکتی۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی | یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دُنیا میں، جسکا ذرّہ ذرہ فانی ہے، موت کا زبردست ہاتھ زندگی کے نقوش مٹاتا نہیں جا رہا ہے، اور لہذا کیا موت قاطع حیات نہیں؟ اقبالؔ کی حیرت انگیز ذہانت نے اس معمہ کو بہترین طریقے سے سُلجھایا ہے:-

ہوا جب اسے سامنا موت کا | کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اُتر کر جہانِ مکافات میں، | رہی زندگی موت کی گھات میں!
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج | اُٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج!
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے | اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے!
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات | اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات!

---

مزید براں ہمیں یہ فرض کر لینے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں کہ ہمارے جسم یعنی حیاتیاتی ڈھانچے کے مُردہ یعنی بے کار ہو جانے سے حیات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ہیلم ہولٹز (Helmholtz) نے ثابت کیا تھا کہ ہمارا شعور اعصابی برانگیختگی (Nervous Excitation) کا فوراً احساس نہیں کر سکتا، لیکن اُسکے لیے وقت درکار ہے۔ لہذا یہ لازم آتا ہے کہ ہمارا موجودہ عضویاتی ڈھانچہ خودی کے موجودہ 'تصورِ زمان' کا تابع ہے۔ لیکن خودی، موجودہ زاویۂ نگاہ کے علاوہ دوسرے زاویوں سے بھی زمان کا تصور کرنے پر قادر ہے۔ خواب میں ارتسامات (Impressions) کا بے انداز ارتکاز، اور موت کے حافظے کا حیرت انگیز ارتفاع جو بعض حالتوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے، اسکی دو مثالیں ہیں۔ لہٰذا موت کو ہم ایک ایسے عالم سے تعبیر کر سکتے ہیں جس میں خودی کو تصورِ زمان کا ایک خاص زاویۂ نگاہ حاصل ہوتا ہے، اور اس عالم کو قرآنی الفاظ میں "عالمِ برزخ" کہا جاتا ہے۔ خودی کو اس عالم میں حقیقت کے تازہ

اور نئے پہلوؤں کا احساس ہوتا ہے اور وہ اُنکے معانقے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتی رہتی ہے' یہ عمل اسوقت تک جاری رہتا ہے کہ اُس کو داخلی حیثیت سے حشر پیش آتا ہے اور وہ لا متناہی خودی کے مقابل پیش ہو جاتی ہے؛ اب اسکے گذشتہ اعمالؔ افعال اور آیندہ زندگی کی ممکنات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسکے بعد جہنم ایک حالت ہے، اور معیار انسانیت سے گر جانے کی ناکامی کا دردناک احساس؛ اور جنت مخالف و پریشان کُن طاقتوں پر فتح و کامرانی کے حصول کی بے پایاں مُسرّت؛ اب ہر لمحہ ایک تازہ جلوہ کا ظہور اور حقیقت کے ایک نئے احساس کا شعور ہوتا ہے' اسطرح انسان آگے بڑھتا جاتا ہے' اور زندگی کا کبھی نہ ختم ہونیوالا تسلسل قایم رہتا ہے ؎

زندگانی انقلاب ہر دمے ست زانکہ او اندر سُراغ عالمے ست

مجموعی لحاظ سے، حیات' تربیت خودی اور بقائے شخصی کا محمود ترین لائحہ عمل ہمیں ذیل کے تین اشعار میں ملجاتا ہے، جس میں حضرت علاّمہ نے ضرب کلیم کے ناظرین سے بدین الفاظ خطاب کیا ہے:-

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر  تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دستِ ضربِ کاری کا ہے مقام  میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!
خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات  فطرت لہو ترنگ ہے' غافل! نہ جلترنگ

اگر یہ سچ ہے کہ یہ اشعار کسی شاعر کی زبان سے نکلے ہیں تو انسان کی نگاہ اس بلندی کے تصور سے عاجز ہے، جہاں شاعر پہنچ گیا ہے!

# حقایق

معتقدات۔ خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ کچھ اس طرح انسان کے قلب و دماغ سے چپک جاتے ہیں کہ انکا چھڑانا گویا ایک افیمی سے نشہ چھڑانا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی روایات پرستی ایک مشہور و معروف چیز ہے۔ جس کی وجہ سے آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ جونہی کسی خدا کے بندے نے قرآنِ کریم سے کوئی ایسی حقیقت پیش کی جو اسلاف میں سے کسی مفسر کے قول یا کسی روایت کے خلاف جاتی ہو تو اس طبقہ کی طرف سے فوراً اس پر "منکرِ حدیث" اور "قابل قرآن" کا لیبل لگا دیا جاتا ہے تاکہ کوئی اسکے کہنے پر توجہ ہی نہ دے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری روایات کا مجموعہ ایسا ہے جسے کوئی بڑے سے بڑا روایت پرست بھی تنقید سے بالا نہیں سمجھتا۔ ہندوستان کے اہل حدیث طبقہ میں مولانا ابوالکلام آزاد ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ لیکن اسلاف کی تفسیروں میں جو روایات اور احادیث آتی ہیں اُنکے متعلق اُن کی تحقیق اور رائے قابل غور ہے۔ انھوں نے آیت من اظلم ممن منع مساجد اللہ ...... الخ ۱۱۴ کی تفسیر میں امام ابن جریر کی روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

"ہم نے یہ روایتیں اس لیے نقل کیں تاکہ ہمارے علمائے کرام اندازہ کر سکیں کہ ہماری تفاسیر کی عام روایات و آثار کا کیا حال ہے اور کس طرح رطب و یابس اور غث و ثمین کا انہیں مجموعہ بنا دیا گیا ہے۔ امام ابن جریر اس جلالت و عظمت کے شخص ہیں کہ نہ صرف اپنے دورِ زماں میں بلکہ تاریخ اسلام میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں وہ صرف مفسر ہی نہیں بلکہ محدث بھی ہیں اور مورخ بھی۔ باایں ہمہ بلا ادنیٰ نقد و بحث کے ان روایات کو نقل کر کے ترجیح دے رہے ہیں جن کو ایک معمولی بچہ بھی۔ جسنے اپنی ہی تاریخ کے سوانح و سنین یاد کر لیے ہوں بے اختیار ہو کر ٹھکرا دے گا۔ جب تفسیر طبری کا یہ حال ہے تو پھر ان متداول تفاسیر و آثار کا کیا پوچھنا جنکے اقتباسات بغیر نقد و بحث کے علمائے حال کی زبان

پر ہوتے ہیں اور جو اسی سے ماخوذ ہیں

اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک کام جمع روایات تھا اور ایک نقد و انتخاب۔ پہلا کام پہلوں کا تھا اور دوسرا پچھلوں کا۔ پہلوں نے اپنا فرض ادا کیا مگر پچھلوں نے غفلت کی۔

(الہلال۔ بابت ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

یہ تو تھا عام تفسیری روایات کے متعلق۔ اب اہل حدیث کے انہی امام صاحب کے خیالات مجموعہ احادیث کے متعلق بھی ملاحظہ فرمائیے، اور مجموعہ احادیث میں بھی کسی معمولی کتاب کے متعلق نہیں، بلکہ بخاری شریف کے متعلق۔ جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کیجاتی ہے۔ اور جس پر تنقید کرنے کا خیال تک بھی دل میں پیدا ہونا اتنا بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے کہ جس کی شاید معافی ہی نہ مل سکے۔ بخاری شریف میں جو حدیث ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ (نعوذ باللہ) جھوٹ بولا۔ اس پر تنقید فرماتے ہوئے۔ حضرت مولانا قمطراز ہیں

"اگرچہ اس کی توجیہ و تاویل کی بہت سی راہیں لوگوں نے کھولی ہیں مگر صاف بات تو وہی ہے جو امام ابو حنیفہؒ کیطرف منسوب ہے اور جسے امام رازی نے دُہرایا ہے یعنے ہمارے لئے یہ تسلیم کرلینا نہایت آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم و تعبیر حدیث میں غلطی ہوگئی بمقابلہ اسکے کہ ایک معصوم اور برگزیدہ پیغمبر کو جھوٹا تسلیم کرلیں۔ اگر ایک راوی کی جگہ سینکڑوں راویوں کی روایت ناقص ٹھہرجائے تو بہرحال غیر معصوم انسانوں کی غلطی ہوگی لیکن اگر ایک معصوم پیغمبر کو بھی غلط بیان تسلیم کیا گیا تو نبوت و وحی کی ساری عمارت درہم برہم ہوگئی" (ترجمان القرآن جلد دوم ص ۴۹۹)

یہی الفاظ اگر کسی ایسے شخص کیطرف منسوب ہوتے جو بدقسمتی سے "اہلحدیث" نہ کہلاتا ہو تو پھر آپ دیکھیے کہ روایت پرست طبقہ کیطرف سے کس قدر محشر انگیز طوفان برپا ہو جاتا۔ حضرات اسلاف علیہ الرحمۃ کے علمی و دینی خدمات ہر احسان شناس کے نزدیک موجب ہزار شکریہ ہیں۔ لیکن یقین ماننے کہ غلطیوں کا امکان

اُن کے دورِ زماں میں بھی ایسا ہی تھا جیسا آپکے زمانہ میں کیونکہ وہ خدا کے رسول نہ تھے۔ اس لئے کسی چیز کو اس بنا پر تنقید کی حد سے بالاتر قرار دیدینا کہ وہ آپ کے زمانہ سے پہلے کہی جاچکی ہے دین میں بڑا غلو ہے۔ اسلاف پرستی کی آڑ ہمیشہ وہ لوگ لیتے ہیں جو اتنے بلند حوصلہ نہیں ہوتے کہ اپنی شکست کا اعتراف کرلیں، جب انہیں اپنے دعوے کے اثبات میں کوئی دلیل نہیں ملتی تو وہ تلاش کرتے ہیں کہ متقدمین سے کسی کا قول ان کی تائید میں ملجائے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ حقیقت، حقیقت ہے خواہ اُس کی تائید میں کسی ایک انسان کا بھی قول آپ کو نہ ملے، اور باطل، باطل ہی ہے۔ خواہ سینکڑوں کتابیں اُسکے حق میں کیوں نہ ہوں۔ اگر آپ اس چیز کو سامنے رکھیں گے تو دین کے معاملہ میں بہت سی فتنہ پردازیوں سے محفوظ رہیں گے +

وَاللّٰہُ عَلٰی مَانَقُولُ شَہِیۡد

## ترسیل زر کا پتہ

قارئین طلوع اسلام ترسیل زر میں احتیاط سے کام لیں اور جملہ زقوم اس پتہ پر ارسال فرمائیں۔

جناب حکیم ذکی احمد خانصاحب

جید پریس بلیماراں دہلی

# بصائر

## دیدہ ور

ملک صالح نجم الدین ایوبی سلطان مصر متوفی ۶۴۷ھ نے چرکسی غلام کثرت سے خریدے تھے تاکہ انکا ایک لشکر تیار کر کے صلیبیوں کے مقابلہ میں کام لے، جزیرہ روضہ کے قریب انکو رہنے کے لیے زمین عطا کی تھی انھوں نے عظیم الشان محلات اور قلعے تعمیر کیے تھے۔ یہ لوگ چونکہ سخت جانباز اور بہادر تھے اور اُنسے بڑے بڑے کارنامے ظہور میں آئے اس لیے سلطان مصر نے اپنے وزرا، امرا اور درباری انہیں میں سے منتخب کیے اسی زمانہ میں علامہ عز الدین بن عبدالسلام مُلک شام سے مصر میں آئے، ملک صالح نے اُن کی تکریم کی اور انکو قضا کا عہدہ دیا۔ ملک صالح کے بعد ایک مقدمہ کے دوران میں قاضی موصوف کے نزدیک یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ یہ ممالک سلطان کے زرخرید ہیں اور آزاد نہیں کیے گئے ہیں اسلیے اعلان کرایا کہ اُنکے جملہ تصرفات خود مختارانہ اقسم بیع وشراء نکاح وطلاق وغیرہ بوجہ عدم حریت ناجائز ہیں اور حکم بھیجا کہ وہ سب کے سب حاضر آئیں۔ میں انکو فروخت کرونگا۔ کیونکہ وہ اسلامی بیت المال کی ملکیت ہیں۔

ممالیک نے جب یہ سُنا تو قیامت برپا ہوگئی اسلیے کہ امارت۔ وزارت۔ سپہ سالاری وغیرہ سلطنت کے تمام بڑے بڑے مناصب پر وہی لوگ تھے قاضی صاحب کو انکے احباب سمجھانے اور اسکے انجام سے ڈرانے لگے مگر انھوں نے مطلق توجہ نہ کی اور شرعی حکم کی تنفیذ پر اڑے رہے +

نائب السلطنت نے غضب ناک ہو کر کہا کہ ہم روئے زمین کے ملوک ہیں۔ قاضی کی کیا مجال ہے کہ وہ ہمارے سامنے دم مارسکے قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں اپنے ہاتھ سے اُس کی گردن ماروں گا۔ یہ کہہ کر اپنے اعوان و انصار کی ایک جماعت کو ساتھ لیئے ہوئے چلا، سب کے سب غصے میں بھرے ہوئے اور ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیئے ہوئے تھے۔ جب اُنکے گھر کے پاس پہنچے تو شور سنکر اُنکا لڑکا باہر نکل آیا۔ کیفیت دیکھ کر سہا ہوا اندر بھاگا اور باپ کو مطلع کیا۔ نہایت بے پروائی سے بُولے کہ تیرے باپ کا یہ رُتبہ کہاں کہ راہ حق میں اُسکا خون بہایا جائے، اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل آئے +

نائب السلطنت کی نگاہ جب اُنکے اوپر پڑی تو جلال حق سے کانپنے لگا۔ تلوار ہاتھ سے گر گئی، اور رو کر بُولا کہ یا مولانا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا کہ تم لوگونکو فروخت کرونگا۔ بولا کہ قیمت کون لے گا۔ جواب دیا کہ میں۔ اور اسکو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کرونگا۔ چنانچہ یہی کیا۔ اور سرِ بازار اُن سب کو فروخت کرا دیا۔

قاضی عزالدین اربابِ حال میں سے تھے اور اُنکا لقب سُلطان العلمار تھا +

---

قاضی عزالدین پہلے دمشق میں قضا کے عہدہ پر تھے وہاں کے امیر اسمٰعیل نے جب صلیبیونکو صیدا اور قلعۂ شقیق دینے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ ملایا۔ اسوقت اُنھوں نے اعلان کیا کہ خطبوں میں سے اسمٰعیل کا نام نکالدیا جائے۔ وہ یہ سُنکر غضب ناک ہوا۔ اسلیئے یہ دمشق چھوڑکر مصر کیطرف چلے، چونکہ نہایت محترم تھے، اسوجہ سے اُمرا اور اعیان شہر نے روکنے کی کوشش کی، اور کہا کہ ہم اسمٰعیل کو راضی کرلینگے آپ ہمارے ساتھ چلکر صرف اس کی دست بوسی کرلیجیے۔ فرمایا کہ میں تو اس پر بھی راضی نہیں ہوں کہ تمہارا امیر میری دست بوسی کرے چہ جائیکہ میں خود اسکا ہاتھ چوموں۔ اللہ کا شکر ہے جسنے اس آفت سے مجھ کو پناہ میں رکھا ہے جس میں تم لوگ مبتلا ہو۔ جاؤ۔ تم دوسرے عالم میں ہو اور میں دوسرے عالم میں۔

جب یہ مصر میں آکر قاضی ہوئے اس زمانہ میں سلطانی حاجب امیر فخر الدین جسکے ہاتھ میں سلطنت کی باگ تھی ایک مسجد کے دروازہ پر بالاخانہ بنایا تھا جسپر نوبت بجائی جاتی تھی قاضی موصوف نے جب اسکو دیکھا تو فوراً توڑنے کا حکم دیا اور امیر فخر الدین کے ناقابل شہادت ہونے کا اعلان کردیا۔ اور یہ خیال کرکے کہ اسکی مخالفت میں میں اپنے منصبی فرائض ادا نہ کرسکونگا۔ استعفا لکھ کر بھیجدیا اور عدالت سے چلے آئے۔ ملک صالح کو جب علم ہوا تو اس نے خود جاکر اس بالاخانہ کو گروا دیا اور انکو راضی کرکے دوبارہ مسند عدالت پر لایا۔

فخر الدین اور اسکے رفقاء سمجھتے تھے کہ قاضی کے اعلان کا ہمارے اوپر کیا اثر ہوسکتا ہے، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اسی دوران میں ملک صالح سلطان مصر نے خلیفہ بغداد مستعصم کے پاس کسی امر خاص کے متعلق سفارت بھیجی۔ سفیر نے وہاں پہونچکر جب خلیفہ کو پیغام سنایا تو خلیفہ نے دریافت کیا کہ اسکو تم سے سلطان نے خود کہا تھا یا کسی اور نے۔ سفیر نے جواب دیا کہ امیر فخر الدین نے۔ خلیفہ نے کہا کہ عزالدین نے اسکو ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے اسلیے اس کی روایت کو ہم قبول نہیں کرسکتے مجبوراً سفیر نے واپس آکر سلطان کی زبان سے پیغام لیا۔ اور بغداد جاکر خلیفہ سے جواب لایا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ قاضی شرف الدین بن عین الدولہ کا ہے جو مصر میں قاضی تھے ان کی عدالت میں ملک کامل سلطان مصر کسی مقدمہ میں شہادت میں طلب ہوا۔ وہ چونکہ روزانہ ایک مغنیہ کا گانا سنا کرتا تھا۔ اسوجہ سے قاضی موصوف نے اس کی شہادت لینے سے انکار کردیا۔ اسپر اس نے قاضی کی شان میں سخت کلمہ استعمال کیا۔ قاضی نے کہا کہ یہ عدالت کی توہین ہے۔ اور اسی وقت اپنی برطرفی کا اعلان کرکے مسند سے اٹھ کر چلے آئے سلطان نے مجبوراً جاکر معافی چاہی اور انکو راضی کیا۔ کیونکہ اسکو اپنی بدنامی اور نامقبولیت کا خطرہ ہوا۔

(تاریخ الامت حصہ ششم)

# تکلّف برطرف

راززی

غالب مرحوم نے پتہ نہیں کس عالم میں یہ کہا تھا کہ ـــ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اُس کی حقیقت اور نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں مسئلہ شہید گنج سے متعلق جب ملک برکت علی صاحب نے ایک بل کا مسودہ پنجاب اسمبلی میں پیش کرنا چاہا تو اس بل کو مسترد کر دیا گیا۔ یہ ظاہر تھا کہ گورنر پنجاب کے اس فیصلہ کے خلاف مسلمانوں کے غیظ وغضب کا کیا عالم ہوگا۔ لیکن وفاشعاران ازلی آگے بڑھے اور انھوں نے سینہ سپر ہو کر اعلان کر دیا کہ اس میں گورنر صاحب کا کوئی قصور نہیں، انہیں تو ہمیں نے مشورہ دیا تھا کہ ایسا کریں۔

یہ تو وفاداری بشرطِ استواری کا ایک واقعہ تھا۔ اب ایک دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ فرمایئے +

مہاتما گاندھی نے جب مسٹر جناح سے ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں باہمی مفاہمت کی گفت وشنید شروع کی تو بعض مسلم حلقوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ مسلمانوں میں ذرا جماعتی زندگی کا احساس پیدا ہوا ہے اس لیئے وہ کانگرس جو ملک میں حکومت اور اپنے سوا کسی جماعت کا وجود تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اب لگی ہے لیگ کے صدر سے مفاہمت ضروری سمجھنے اس خیال کی اشاعت سے چونکہ ہندوؤں کی خودداری کو ذرا ٹھیس لگتی تھی۔ اس لیئے ایک اور "وفاشعار ازلی" آگے بڑھے اور انھوں نے سینہ سپر ہو کر اعلان فرما دیا کہ کون کہتا ہے کہ ہندو جھک کر مفاہمت کیطرف بڑھے ہیں یہ تو ہم نے اُن کی منت سماجت کی تھی۔

سچ ہے "توڈیت" اور "نئیسں الاحراریت" میں فرق صرف آقاؤں کے نام بدل دینے کا ہے ورنہ:-

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی۔ نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللّٰہی۔ وہی مرحبی وہی عنتری

انھوں نے اپنا مقدس فریضہ ادا کردیا۔ اب مسٹر جناح پڑے اعلان کرتے پھریں کہ یہ بالکل غلط کہتے ہیں بلکہ مسٹر جناح کی اس تردید سے تو اُن کی اس خدمت جلیلہ کا وزن اور بھی بڑھ گیا ہوگا۔ کہ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

---

یادش بخیر مسٹر ساورکر۔ پردہان ہندو مہا سبھا نے مہاراشٹر کی ادبی کانفرنس کے خطبہ صدارت کے دوران میں فرمایا کہ صدرِ کانگرس کی یہ تجویز کہ ہندوستان میں لاطینی رسم الخط رائج کردیا جائے بالکل مہمل ہے۔ اس لئے کہ اس سے ہندوستان اور مغرب کے روابط کا سلسلہ اور بھی مستحکم ہو جائیگا ایک طرف تو ہندوستان اور یورپ کے رشتہ بھی کے استوار ہونے سے اسقدر نفرت لیکن دوسری طرف اپنے اس دعوے کی دلیل میں سند بھی یورپ ہی سے لاتے ہیں فرماتے ہیں

دیکھئے ڈی ویلرا نے آئرستان کی آبادی کے بعد سب سے پہلا قدم آئرش کی زبان کی احیاء کیطرف اُٹھایا۔ اسی طرح ہٹلر نے بھی جرمنی زبان اور کلچر کے تحفظ و تجدید کے لیے جہادِ عظیم کیا۔ لہذا ہندو آزادی حاصل ہونے کے بعد اپنی زبان اور کلچر کی ترویج و اشاعت کیوں نہ کریں۔

یعنی جو کچھ ہٹلر نے قوت حاصل ہونے کے بعد کیا وہی کچھ ہندو کرنا چاہتے ہیں جرمن آریوں نے سامی نسل کے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ بھارت ورش کے آریہ سپوت ملیکش مسلمانوں کو ملک بدر کرنا چاہتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ زبان کا مسئلہ کچھ مشکل نہیں۔ ہندوستان کی قومی زبان وہی زبان ہوگی جو یہاں اکثریت کی زبان ہے۔ یعنے ہندی جس کی اساس سنسکرت ہو۔

ٹھیک! متحدہ قومیت کی زبان وہ جو اکثریت کی زبان ہو۔ اور اس سے آگے اسکا مذہب وہ جو اکثریت کا مذہب ہو۔

لیجئے۔ ہندو مسلم سوال حل ہوگیا۔ لوگ ان کاموں کے لیے تحقیقاتی کمیشن بٹھایا کرتے ہیں۔ ملک میں اگر ایسے دو چار اور "چھاجھکن" پیدا ہو جائیں تو بھارت ماتا کی آج مکتی ہو جائے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(مسٹر ساورکر نے غالباً یہ تو نہ سنا ہوگا کہ اسی ہٹلر نے زیکو سلاویکیا کے متعلق یہی اعلان فرمایا ہے کہ وہاں کی جرمنی آبادی کو جو نہایت اقلیت میں ہیں۔ اپنی زبان اور کلچر کی حفاظت کی کامل ضمانت ملنی چاہیئے!)

---

ہندوستان کے متعلق چونکہ یہ مشہور ہے کہ ایک مذہب پرست ملک واقع ہوا ہے۔ اس لیے یہاں ہر شے کے خمیر میں مذہب کا چھینٹا ضرور دیدیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ دہلی کے ریڈیو اسٹیشن کا پروگرام بھی اسی چھینٹے سے خالی نہیں رکھا گیا۔ وہاں جمعہ کے دن صبح کے وقت قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد قوالی شروع ہو جاتی ہے۔ دن بھر مختلف اوقات میں محبوب قوال اور کلن قوال "مذہب پرست" حلقہ کی اس گلہ طرازی کی تردید کرتے رہتے ہیں کہ گورنمنٹ مسلمانوں کے امور کا کچھ خیال نہیں کرتی۔ سہ پہر کو جو قوالی ہوتی ہے تو اس کا نام ہی "قوالی جمعہ" (FRIDA Y CONCERT) رکھا گیا ہے +

مسلمانوں میں جمعرات "اہل طریقت" کا دن سمجھا جاتا تھا کہ جس دن عام مزاروں پر قوالیاں ہوتی ہیں اور جمعہ اہل شریعت کا کہ جس میں نماز و وظائف کے سے خشک اعمال پر زور

دیا جاتا ہے۔ لیکن اب حکومت کی کرم فرمائی سے یہ امتیازات بھی مٹ گئے، اور "طریقت و شریعت" کا دن ایک ہی ہوگیا۔ یہ ہیں برکاتِ عہد انگلشیہ۔ قوالوں کی ڈھولک کی آواز تو خیر مزار کے ارد گرد ہی رہتی تھی لیکن محطۂ نشر الصوت میں جو قوالی ہوتی ہے۔ اس کی ڈھولک کی آواز تو تمام دُنیا میں پھیلتی ہے اور اس طرح ہر جگہ تبلیغ کرتی ہے کہ یہ ہیں مسلمانوں کے مقدس دن کی خصوصیات۔ سچ فرمایا ہے فرمانے والے نے کہ۔

آ تجھ کو بتاؤں میں۔ تقدیرِ اُمم کیا ہے ! شمشیر و سناں اوّل۔ طاؤس و رباب آخر
(اقبال رحم)

لاہور کے ایک ادبی رسالہ میں "جھوٹ" کے عنوان سے حسبِ ذیل نظم شائع ہوئی ہے۔

موت کے بعد آئے گی۔
اور پھر ایک زندگی
جاودانی زندگی!
غیر فانی زندگی!
ایک بہارِ بے خزاں
ایک نشاطِ بیکراں
لذتیں کیفیتیں !
راحتیں ہی راحتیں !
کتنا دلکش ہے یہ جھوٹ !

یہ ظاہر ہے کہ نظم میں شعریت کے اعتبار سے کوئی رنگینی نہیں۔ ندرتِ بیان نہیں۔ رفعتِ تخیل نہیں۔ صرف قافیہ بندی ہے۔ لہٰذا یہ شعر نہیں "حقایق" ہیں۔ اور اسی لئے شاید یہ شائع بھی کئے گئے ہیں۔ لیکن کچھ علم بھی ہے آپ کو اس تحقیق کا شرف کس ذاتِ گرامی کو حاصل ہے؟ انکا اسم مبارک ہے سعید احمد اعجاز۔ سبحان اللہ! احمد (فداہ ابی وامی) کے نامِ نامی کے ساتھ یہ نسبت اور

دینِ احمدؐ کے ساتھ یہ استہزاء ÷

پھر نظم کا انداز ملاحظہ ہو۔ گویا ایک رائل کمیشن مقرر ہوا تھا کہ وہ اِس امر کی تحقیق کے بعد رپورٹ پیش کرے کہ واقعی مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ ہوتا ہے یا یہ محض ایک ڈھکوسلہ ہی ہے۔ اور یہ صاحب تھے اس کمیشن کے صدر۔ اب انھوں نے تحقیقات مکمل کرکے رپورٹ پیش کی ہے کہ نہیں صاحب! سب جھوٹ!!

یہ نمونہ ہے' ان برخورداروں کا جو کل کی "ملّتِ اسلامیہ" بننے والے ہیں!

اور اگر ان سے دیار رسالہ والوں سے، پوچھیے تو کہہ دیںگے کہ صاحب یہ شاعری کے فلسفیانہ نکات ہیں' ان باتوں کے متعلق زیادہ حسّاس نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا تو ہوتا ہی چلا آیا ہے حالانکہ شاعری میں بھی جو ہوتا چلا آیا ہے اس میں اور آج کے رُجحانات قلبی و ذہنی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ایک اور صاحب ہیں حضرت مجازؔ۔ بی۔ اے (علیگ)، اُنکی ایک نظم دہلی کے ایک ادبی رسالہ میں شائع ہوئی ہے۔

## نوجوانؔ خاتونؔ سے!

دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

حجابِ فتنہ پرور اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا

اثر باقی نہیں معلوج پیروں کی دعاؤں میں
جوانانِ بلاکش کی دعا لیتی تو اچھا تھا

پتہ نہیں اس "بزرگانہ مشورہ" کے جواب میں اُدھر سے پردہ ہی اُٹھایا کچھ اور لیکن جو کچھ بھی جواب میں آیا ہو۔ حضرت مجازؔ کو اس سے حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ نیک بد سمجھائے جانا چاہیے کوئی مانے یا نہ مانے۔ مشکل یہ ہے کہ خطاب انھوں نے کیا ہے۔ نوجوان خاتون سے اور نوجوان نصیحت کم ہی مانا کرتے ہیں۔ بہرحال ایک کثیر طبقہ انکی مساعی جمیلہ کے نتائج کا منتظر ہے اور انکی دُعائیں انکے ساتھ ہیں اگر یہ اس صبر آزما مرحلہ میں کامیاب ہو جائیں تو قوم کو چاہیے کہ اس بطلِ جلیل کی خدمات کے اعتراف میں انکا مجسمہ نصب کرائے اور نوبل پرائز کے لیے سفارش کرے۔ بقولِ اقبالؒ!

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
÷ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

# رفتارِ زمانہ

## چین اور چینی مسلمان!

چین کے مسلمانوں کے متعلق ہندوستان کے مسلمانوں نے بہت کچھ سنا ہے مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ چینی مسلمانوں کو حکومت میں کتنا دخل ہے اور انکی فوجی قوت اور جنگی اولوالعزمیوں کا کیا حال ہے۔ اتفاق سے اسوقت چین اور جاپان کی جنگ چھڑی ہوئی ہے اس لیے چینی فوج کے ساتھ وہاں کی مسلم فوج کے حالات اور انکے شاندار جنگی کارنامے بھی منظر عام پر آرہے ہیں۔

اس سلسلہ میں اخبارات کے ذریعے متعدد مضامین شائع ہوچکے ہیں مگر ہم یہاں مستند ذرائع سے اور خود چینی مسلمانوں کی زبانی چینی فوج کے مسلمان قائدین کے حالات پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جنگی قوت واہمیت کے ساتھ انکی وطن دوستی اور اسلام پروری کا اچھی طرح علم ہوجائے۔

کچھ دن ہوئے قاہرہ میں چینی مسلمانوں کا ایک وفد پہونچا تھا جو آٹھ ارکان پر مشتمل تھا یہ سب لوگ حکومت چین کے سرکاری عہدیدار ہیں اور انکے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی حمیت میں غرق ہیں اور پکے اور سچے مسلمان ہیں۔ رئیس وفد کا نام جلال الدین وانگ چیانگ ہے۔ آپ چین کی مجلس مقننہ کے رکن بھی ہیں انکے پرائیویٹ سکرٹری کا نام ابراہیم فو ہے۔ ارکان میں یوسف چیانگ اور داؤد چیانگ ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔

مصر کے مشہور اسلامی اخبار "البلاغ" کے نمائندہ نے اس وفد سے ملاقات کرکے جو اہم بیان حاصل کیا ہے ہم ذیل میں اسکی تلخیص پیش کرتے ہیں۔

یہ وفد جنوری ۱۹۳۸ء کو شنگھائی سے عازم بیت اللہ ہوا اور حجاز پہونچکر انہوں نے حج ادا کیا۔ انکا وفد کا بیان ہے کہ اسلام کی روحانی عظمت کا جو منظر ہم کو حجاز مقدس میں نظر آیا وہ کسی اور جگہ نہیں آیا"۔

وفد کا بیان ہے کہ چینی فوج میں مسلمانوں کی کثرت ہے جنکے قائد اعلیٰ جنرل چیانگ کائی شیک ہیں یہ جنرل گو مسلمان نہیں ہیں مگر مسلمانوں سے خاص انس اور محبت رکھتے ہیں۔ اور انکی شجاعت و فداکاری کے معترف ہیں۔ چین کا سب سے بڑا فوجی افسر ایک مسلمان ہے جسکا نام عمر یانون چی ہے۔ وفد کا بیان ہے کہ اس جنرل کی قیادت میں تین لاکھ مسلمان ہیں جو تمام چین میں اپنی شجاعت کے لیے مشہور ہیں وفد نے نمایندۂ البلاغ" سے بیان کیا کہ جاپان نے چین پر حملہ کر کے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچایا ہے اور انکے بہتسے مذہبی ادارے اور اوقاف تباہ کر دیے ہیں۔ ان میں مرحوم شاہ فواد ثانی مصر کا کتب خانہ بھی ہے جو انکے نام مسلمانان چین نے قایم کیا تھا جسکے لیے مرحوم نے دس بارہ ہزار کتابیں وقف کی تھیں۔

غربی شمالی چین کی آبادی خالص مسلمانوں پر مشتمل ہے یہاں تک کہ حکام افسر اور فوج کے قائد بھی مسلمان ہیں۔ یہاں کی اسلامی افواج کے کمانڈر انچیف کا نام عمر یاے چیانگ ہی ہے دوسرا مسلمان فوجی افسر جنرل خالد ما ہونگ کوئی ہے جسکے پاس ایک لاکھ مسلمان فوج ہے۔ جنرل عمر نہ صرف ایک لاکھ مسلمانوں کے افسر اعلیٰ ہیں۔ بلکہ جنرل چیانگ کائی شیک کے دست راست اور معاون بھی ہیں انہنے مختلف میدانوں میں جاپانی فوج کو شکست دی ہے۔

چینی مسلمانوںکا یہ فقرہ کتنا حق بجانب ہے کہ۔

واخواننا المسلمون من ابناء الوطن البررة المخلصين المشهورين بالوفاء والتضحية يعرفون حق المعرفة ان العدو لا يفرق بين المسلمين وغير المسلمين فى تقتيلهم وتذبيحهم ولا يميزون المساجد من المعابد فى تخريبهم وتدميرهم فاذا دافعوا عن الوطن المشترك فقد دافعوا عن انفسهم ودينهم (البلاغ)

مسلمان اہل وطن جو ایثار و قربانیوں میں مشہور ہیں خوب جانتے ہیں کہ دشمن (جاپان) قتل و غارتگری میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں کریگا اور منادر کے ساتھ مساجد کو بھی مسمار کرے گا اسلئے اگر چین کے مسلمان مشترک وطن کی مدافعت کے لیے کھڑے ہوگئے ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنی جان اور اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔

## مغرب اقصےٰ مجاہدین ریف اور جنرل فرانکو

اسپین کی جنگ ابھی تک علےٰ قدم و ساق بحالہ قایم ہے۔ باغیوں کا سردار جنرل فرانکو مغرب اقصےٰ کے مسلمانوں کے لیے عذاب الیم بنا ہوا ہے اور اُسنے مسلمانونکو جن میں عورتیں، بچے بوڑھے سب ہی شامل ہیں، جنگ کی آگ میں دھکیلنے کا وہ خوفناک طریقہ اختیار کیا ہے جس کو سُن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اس سلسلہ میں مغرب اقصےٰ کی جمعیات اسلامیہ کے صدر نے ایک بیان اخبار البلاغ (مصر) اور جریدہ صوت الشعب میں شایع کرایا ہے، جو بہت ہی مبسوط اور بہت ہی زہرگداز ہے ہم اُسکی تلخیص ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

(۱) جنرل فرانکو نے مختلف طریقوں سے ریف کے مسلمانونکو زبردستی میدان قتال میں دھکیل دیا ہے اور اب تک ایک لاکھ مسلمان اس جنگ میں کام آچکے ہیں۔

(۲) اخیر میں جنرل فرانکو نے ریف کے مسلمانونکا صفایا ہی کردیا یعنی ستر سال کے بوڑھوں اور چودہ سال کے بچوں تک کو پکڑ کر میدان قتال میں بھیجدیا تاکہ وہ فوجیوں کا کھانا پکائیں، اور انکے کپڑے صاف کریں اور ضرورت ہو تو اُن کو ہلاکت و بربادی کے لیے دشمن کے مقابلہ پر روانہ کردیا جائے

(۳) جنرل فرانکو نے حال ہی میں ریف کی معصوم اور عفت مآب عورتونکو اسپین بھیجدیا ہے، ان میں جو بڑی عورتیں ہیں اُنکے ذمے فوجیونکا کھانا پکانا اور کپڑے دھونا وغیرہ کام لگادیے ہیں اور جو چھوٹی اور کم سن ہیں، انکو معمولی مشق کرانے کے بعد عورتوں کی فوج میں داخل کرلیا ہے ان میں بھی جو

حسین اور خوبصورت ہیں ان کو جنرل فرانکو نے زبردستی مغربی فوج کے ہمراہ کر دیا ہے کس مقصد کے لئے؟ اس کا جواب آسان ہے اور اس کے تصور سے ہماری گردنیں شرم کے مارے جھک جاتی ہیں

(۴) پہلے پہل زعماء ریف جنرل فرانکو کی چال میں آگئے کیونکہ اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ منطقہ ریف کو بالکل آزاد کر دیا جائیگا اور وہاں عربوں کی مستقل اور آزاد حکومت قائم کر دی جائے گی۔ چنانچہ اس وعدہ پہ مغرور ہو کر بہت سے زعماء نے جنرل فرانکو کا پروپیگنڈ کیا اور ہزاروں مسلمانوں کو اسپین کی جہنمی جنگ میں دھکیل دیا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ جب ریف میں سوائے بیواؤں اور یتیموں کے مردوں کا نام و نشان بھی نہیں ہے تو وہاں حکومت کس کی قائم ہوگی؟

لیکن وہ وقت بھی آگیا جس میں جنرل فرانکو کے وعدوں کا پردہ صاف الفاظ میں چاک کر دیا گیا۔ چنانچہ تطوان کے کمشنر کرنل بیکبیڈیو نے جو جنرل فرانکو کا دست راست سمجھا جاتا ہے تمام اخبارات میں یہ اعلان شائع کرا دیا ہے کہ اہل ریف کو آزاد کرنے اور مغرب اقصیٰ میں عربوں کی حکومت قائم کرنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا۔ اور جو عرب جنگ اسپین میں جنرل فرانکو کا ساتھ دے رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو کافی روپیہ بطور حق المحنت دیا گیا ہے!

(۵) جب مغرب اقصیٰ کے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان کو معلوم ہوا کہ جنرل فرانکو کے وعدوں کا کیا حشر ہونے والا ہے تو انہوں نے تطوان میں سخت احتجاج کیا مگر ان کو اس کا صلہ یہ ملا کہ کثرت کے ساتھ بازاروں اور گھروں میں قتل کر دئے گئے۔ بہت سے قید خانوں میں ڈال دئے گئے اور بقیۃ الباقیہ کو گرفتار کرکے اشبیلیا میں نظر بند کر دیا گیا۔

(۶) باغیوں نے یعنی جنرل فرانکو کے اعوان و انصار نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا ہے کہ غرناطہ کے قصر الحمراء اور جامع قرطبہ میں (جو عربی حکومت کے آثار باقیہ ہیں) حربی ذخائر جمع کر دئے ہیں اور ان کو میگزین بنا دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت ان کو تباہ کرنے کے لئے گولہ باری کریگی اور یہ بیکسی اور یہ آثار و اطلال جو اسلامی عظمت و شوکت کا آخری سہارا ہیں بمباری سے مسمار ہو جائیں گے اور اسلام کے نقوش تک کا اسپین سے صفایا ہو جائیگا۔

(۷) رلیف کے اطراف میں مساجد اللہ میں نماز جمعہ اور نماز پنجگانہ بھی ختم ہوگئی ہے کیونکہ جب مرد ہی باقی نہ رہے تو مساجد کو معمور کون کریگا بلکہ اس کے ساتھ جو لوگ باقی ہیں ان کو عیسائی بنانے کے لیئے پادریوں کو ششیں شروع کردی ہیں چنانچہ پادری روزانہ مسلمانوں پر مقدس پانی چھڑکتے ہیں اور انکو عیسائی بننے کی ترغیب دیتے ہیں شفاخانوں میں اگر کوئی مسلمان مریض اپنی گردن میں صلیب لٹکانے سے منع کرتا ہے تو اس کو کھانا تک نہیں دیا جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر مرجاتا ہے۔

(۸) فسطائی حکومت نے ان مغربی مسلمانوں پر جو حج کر کے واپس ہوئے ہیں یہ لازم کردیا ہے کہ وہ روم جاکر پوپ سے برکتیں حاصل کریں اور مکہ مکرمہ کے بعد روم کا بھی حج اور طواف کریں۔

(۹) جو مسلمان خندقوں اور میدانوں میں بیٹھ کر جنگ کر رہے ہیں انکو چوبیس گھنٹوں میں کیک کا ایک ٹکڑا یا خنزیر کا بہت تھوڑا گوشت دیا جاتا ہے اور وہ بیچارے جبراً و قہراً ان چیزوں کا استعمال کرتے ہیں اور اپنی قسمتوں کو روتے ہیں!!

## فلسطین

اٹلی اور انگلستان میں گفت و شنید کے بعد جو معاہدہ ہوا ہے وہ فلسطین کے حق میں نہایت ہی خطرناک ہے! فلسطین کے بارہ میں اٹلی کے مطالبات حسب ذیل تھے۔

(۱) فلسطین میں انتداب باقی رکھا جائے (۲) فلسطین کو تقسیم نہ کیا جائے اور نہ اسکو یہودی مملکت قرار دیا جائے (۳) مستقبل میں جو حالات رونما ہوں انکے بارہ میں اٹلی سے ضرور مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ حکومت اٹلی نے اپنے ریڈیو اسٹیشن سے عربی میں تقریروں کا سلسلہ اسی لئے جاری کیا تھا کہ عربوں کو سرگرم عمل رکھا جائے اور برطانیہ کو مرعوب کیا جائے۔ اس مقصد میں اٹلی کو کسقدر کامیابی بھی حاصل ہوئی اور برطانی اخبارات اور پارلیمنٹ کے ارکان برابر اسکے خلاف اپنی آواز بلند کرتے رہے یہ سوال کہ آخر اٹلی کیوں عربوں کی حمایت کرتا رہا اور یہودیوں کی مخالفت میں اس نے کیوں اتنا وسیع پروپیگنڈہ کیا؟ اسکا جواب حسب ذیل دفعات میں مل سکے گا۔

(۱) فلسطین میں انتداب قایم رہنے کی صورت میں برطانیہ کو انتدابی قواعد وضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے یعنی وہ فلسطین میں نہ تو جنگی کارخانے قایم کرسکتی ہے نہ قلعے تعمیر کرسکتی ہے اور نہ تعداد سے زیادہ فوج رکھ سکتی ہے، لیکن اگر انتداب اُٹھ جائے تو برطانیہ یہ سارے منصوبے پورے کرسکتی ہے اور اُس سے اٹلی کو جو نقصان پہنچ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

(۲) اٹلی کو خوب معلوم ہے کہ تقسیم فلسطین کے بعد ارض قدس میں یہودی مملکت قایم ہوجائیگی اور جب یہ ہوگا تو برطانیہ، حیفا عکہ اور دیگر بحری مقامات کو بحری مستقر آسانی سے بناسکے گی اور اٹلی کی بحری قوت کو خطرات لاحق ہوجائینگے۔

(۳) اٹلی اس حقیقت سے باخبر ہے کہ اگر فلسطین میں یہودی مملکت قایم ہوگئی، تو اس کا میلان اشتراکیت کیطرف ہوگا جو فسطائی تحریک کی مخالف سمت میں واقع ہے۔

مگر برطانی، اٹلی گفت وشنید اور معاہدہ کے بعد اٹلی بھی ہلکا پڑگیا ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ آئندہ فلسطین کے معاملات میں کوئی ایسی مداخلت نہیں کریگا جو بالواسطہ عربوں کے حق میں مفید ہو۔ چنانچہ تازہ ترین خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ فلسطین میں فوجی ہوائی مستقر قایم کررہی ہے اور اُس کا ارادہ ہے کہ فلسطین کو چاروں طرف سے فوجی محاصرہ میں لے لیا جائے۔ فلسطین کے موجودہ حالات سو وہ نہایت خطرناک ہیں۔ اللہ تعالے ارض قدس کے باشندوں پر اپنا رحم فرمائے۔

## ایران میں علمی ترقی

ایران نے اگرچہ بہت ہی قلیل مدت میں ترقی کی ہے اور ترقی کے میدان میں آئے ہوئے اُسے ابھی چند سال ہوئے ہیں مگر علمی اور صنعتی ترقیوں میں اُس نے ایک خاص درجہ حاصل کرلیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں تعلیمی بیزانیہ ۷۷،۳،۳۸۰ ریال تھا اور سنہ رواں میں یہ رقم ۱۴،۰۵،۱۵۰ تک پہونچ گئی ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبار کی تعداد کل ۱۵ تھی سنہ ۳۶ء میں طلبار کی تعداد ۲۰۸۳ تک پہنچ گئی مگر اس سال طلبا، کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوگئی ہے۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں ثانوی مدارس کے طلباء کی تعداد کل ۹۰ تھی جن میں لڑکی ایک بھی نہ تھی لیکن سنہ ۱۹۳۶ء میں لڑکوں کی تعداد ۳۰۷۵ اور لڑکیوں کی تعداد ۲۱۱ تھی۔ ابتدائی مدارس کے طلباء کی تعداد سنہ ۱۹۱۳ء میں ۴۲۱۲ اور طالبات کی ۳ تھی مگر سنہ ۱۹۳۶ء میں لڑکوں کی تعداد ۱۶۶۳ اور لڑکیوں کی ۲۵۰۳ تک پہنچ گئی سنہ ۱۹۲۳ء میں معلمین اور معلمات کی تعداد ۴۳۰۳ تھی مگر سنہ ۱۹۳۶ء میں ۱۱۹۰۱ تک پہونچ گئی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں مدارس کی تعداد ۶۱۲ تھی مگر سنہ ۱۹۳۶ء میں ۳۳۹۵ تک پہنچ گئی۔

اب سے کچھ مدت پہلے ایران میں عمرانی وسائل مفقود تھے نہ سڑکیں تھیں نہ ریل گاڑیاں مگر اب جلالۃ الملک رضا شاہ پہلوی کی کوششوں سے ریلوے نے جملہ اطراف کو مربوط کر دیا ہے اور بے شمار سڑکیں جا بجا نکال دی گئی ہیں۔

---

# "کانگرس مسلم لیگ اور مسلمان"

(از جناب عبداللہ جان صاحب شملہ)

مئی سنہ ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام میں مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں ضمناً مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر بھی آگیا ہے۔ مجھے مولانا کے سیاسی مسلک سے کوئی بحث نہیں لیکن صاحب مضمون نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ "قوم پرست" ہو جانے کے سبب مولانا کا آج کا اسلام اُن کے سنہ ۱۹۱۳ء کے اسلام سے پانچ سات درجے نیچے ہے۔ جو ذریعہ استعمال کیا ہے۔ وہ غلط ہے۔

صاحب مضمون کا ثبوت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۳ء میں مولانا نے آیت "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ" کا ترجمہ یہ کیا تھا کہ "آج سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ دوسری تعلیم تلاش کرے تو یقین کرو کہ اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی"۔ اور اسی آیت کا ترجمہ سنہ ۱۹۳۲ء میں مولانا نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ "جو کوئی اسلام کے (راہ عالمگیر سچائی اور تصدیق کی راہ ہے)، کوئی دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی"۔

میرے پاس الہلال کی جلدیں نہیں ہیں لیکن غالباً پہلا ترجمہ مولانا نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ جیسا کہ منقول ہے۔

دوسرا ترجمہ بھی ترجمان القرآن سے صحیح طور پر منقول ہے لیکن اس سے آگے چل کر صاحبِ مضمون نے بقول مولانا "عالمگیر سچائی" کی تفسیر درج کی ہے۔ وہ غلط ہے۔ جو الفاظ اس موقع پر منقول ہیں۔ وہ ترجمان القرآن میں موجود تو ہیں لیکن مندرجہ بالا آیت کے تحت میں نہیں۔ بلکہ مندرجہ ذیل آیت کے ترجمہ کے حاشیہ پر۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ۔

اس آیت کا ترجمہ مولانا نے یوں کیا ہے۔ "نیکی اور بھلائی کی راہ یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف پھیر لیا یا پچھم کی طرف کر لیا (یا اسی طرح کوئی دوسری بات ظواہر و رسوم کی کر لی) نیکی کی راہ تو اُن لوگوں کی راہ ہے جو اللہ پر، اور آخرت کے دن پر۔ ملائکہ پر۔ ۔ ۔ ایمان لاتے ہیں"۔

حاشیہ میں مولانا یوں رقمطراز ہیں :۔

"دینِ حق کی اِس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے۔ بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عمل کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اصل شئے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے شریعت کے ظاہری احکام و رسوم بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔

نُزولِ قرآن کے وقت دُنیا کی عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے۔ دین سے مقصود محض شریعت کے ظواہر و رسوم ہیں، اور انہی کے کرنے نہ کرنے پر انسان کی نجات و سعادت موقوف ہے لیکن قرآن کہتا ہے اصل دین خدا پرستی اور نیک عملی ہے اور شریعت کے ظاہری رسوم و اعمال بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔ پس جہاں تک دین کا تعلق ہے ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے۔ نہ کہ وسائل کی"۔

آیت وَمَنْ يَبْتَغِ ۔ ۔ ۔ ۔ کا جو ترجمہ صاحبِ مضمون نے نقل کیا ہے۔ وہ ترجمان القرآن کے صفحہ ۱۵۰ پر ہے جہاں اس آیت کا ذکر سورۂ فاتحہ کے ضمن میں آ گیا ہے۔ اپنی اصلی جگہ یہ آیت صفحہ ۲۹۷ - ۲۹۸ پر ہے اور اس کا ترجمہ صفحہ ۲۹۸ پر ہے۔ یعنی "جو کوئی اسلام کے سوا (جو تمام رہنمایانِ حق کی تصدیق و پیروی کی راہ ہے) کسی دوسرے دین کا خواہش مند ہو تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا"۔ اس ترجمہ اور صفحہ ۱۵۰ والے ترجمہ میں جو فرق ہے اُس کی وجہ آیت مذکورہ کے سیاق و سباق اور اُن کا ترجمہ غور سے دیکھنے والے پر بخوبی کھل جائے گا +

صاحبِ مضمون نے مولانا کے متعلق جو رائے قایم کی ہے اس کا سارا دار و مدار اسی پر ہے کہ مولانا نے "اسلام جیسی عالمگیر سچائی" کی تشریح یہ فرمائی کہ یہ کوئی خاص شکل کی عبادت یا کھانے پینے کی کسی خاص پابندی کا نام نہیں ہے، مندرجہ بالا حوالوں سے یہ ظاہر ہو جائے گا۔ کہ صاحبِ مضمون سے سہو ہو گیا ہے اور مولانا نے "خاص شکل کی عبادت یا کھانے پینے کی خاص پابندی" کے خلاف جہاں اظہارِ رائے کیا ہے، وہاں قرآن کا منشا بھی یہی ہے۔

جوئے رواں

بملہ حقوق محفوظ

# معارف القرآن

(چودھری غلام احمد پرویز بی اے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ۔ شملہ)

## فاتحۃ الکتاب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ۔ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْاَمِیْنِ وَعَلٰی اَتْبَاعِہٖ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ اَمَّا بَعْدُ:-

## اسلام دین فطرت ہے۔

یہ قرآن کریم کا دعویٰ اور ہمارا ایمان ہے۔ تفصیل اس اجمال کی خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو مفہوم اس سے یہی ہے کہ اسلام کی تعلیم اسقدر سادہ اور سیدھی دل میں اُتر جانے والی ہے اور اُسکے مہمات اصول، قوانین فطرت کی طرح۔ ایسی محکم اور غیر متبدل بنیادوں پر قائم ہیں کہ اس کو قبول کرنے میں ذہن انسانی کو اور اُس پر عمل پیرا ہونے میں قلوب و جوارح کو کبھی انسانی فطرت کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ یہ عین فطرت ہے اور اقتضائے فطرت کیطرح تمام نوع انسانی اسے قبول کرنے پر مجبور ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جس تعلیم کو آج عام طور پر اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے وہ ایسے لاینحل مباحث اور پیچیدہ مسائل کا مجموعہ بنکے رہ گئی ہے کہ بلا کاوش و تردد اُسے قبول کرنا تو ایک طرف۔ انسانی کوششیں ہزار سُلجھانے کی ہمت کریں اُسکی اُلجھنیں پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔ دین فطرت کی حقیقی روح تو ہمیں قرن اولیٰ میں نظر آتی ہے۔ جب کہ اس حقیقت کش تعلیم نے چند سال کے عرصہ میں ایک اونٹ چرانے والی بادیہ نشین قوم کو ایک طرف قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کا وارث بنا دیا۔ اور دوسری طرف مکارم اخلاق کے اس بلند ترین مقام پر پہنچا دیا کہ

انکے اعمالِ حیات آج بھی زندگی کے بحرِ ظلمات میں روشنی کے بلند میناروں کی طرح جگمگا رہے ہیں کہ ہر راہ گم کردہ مسافر کو ان سے صراطِ مستقیم کا نشان مل سکے لیکن وہ دورِ عمل، وہ مجاہدانہ خدا پرستی کا زمانہ جلد گزر گیا۔ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور رفتہ رفتہ ملوکیت کی تمام ہلاکت آفرین خرابیوں کے ساتھ عجمی تکلفاتِ اسلامی تمدن پر چھا گئے۔ یوں تو یہ ملوکیت بنی امیہ سے ہی شروع ہوگئی تھی لیکن عہدِ عباسیہ میں اسلامی روح پر عجمیت اس درجہ غالب آگئی کہ ان نظر فریب۔ زرنگار نقابوں کے اندر عروسِ حقیقت کا سراغ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ یہی دور اتفاق سے ہمارے علمی کارناموں کا درخشندہ عہد ہے۔ یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا اسرائیلیات کے افسانے قصص قرآنی میں "ربط و نظم" قائم کرنے کے لئے زیب داستان بنائے گئے۔ فرصت کا زمانہ۔ فراغت کے دن "شمشیر و سنان کی ولولہ انگیزیاں" طاؤس رباب" کی نرم خیزیوں میں تبدیل ہوگئیں نتیجہ اسکا ظاہر ہے کہ ایک طرف قوائے عملیہ زنگ آلود ہو کے رہ گئے اور دوسری طرف اسلام کی فطری تعلیم عجمی تصورات کے جلو میں فلسفیانہ موشگافیوں اور قصص و روایات کی توہم پرستیوں کی نذر ہوگئی۔

زوالِ بغداد کے بعد صورتِ حالات بد سے بدتر ہوگئی۔ مرکزیت کے فنا ہو جانے سے امت ریت کے منتشر ذروں کی طرح بکھر گئی۔ مختلف زاویئے اور متعدد گوشے الگ الگ مرکز بن گئے۔ اب نہ وہ دلوں میں سپاہیانہ ولولہ اور جوش تھا، نہ دماغوں میں عالمانہ جلوۂ فکر و بصیرت۔ ایران کے آتشکدوں نے اپنی گرمیٔ نفس اور حرارتِ سخن سے ایک نئے تصوف کو فردوسِ نگاہ بنا دیا جسکی رو سے دین نام رہ گیا۔ انفرادی تزکیۂ نفس اور ذاتی ارتقاء روحانیت کا وہ نظامِ اجتماعیت۔ وہ جماعتی اور مرکزی زندگی جو اسلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت تھی جو دینِ فطرت کی اصل تھی نگاہوں سے روپوش ہوگئی۔ اور عملی رہبانیت کے عناصر ایک ایک کر کے جزو دین بن گئے۔ ان حسین و جمیل اور مرصع و منقش عجمی پردوں میں ملبوس پیکرِ اسلام جب درۂ خیبر سے آگے بڑھا تو ہندوستان کی دیدانتی

آگے بڑھکر اس کے ماتھے پر سندور کا قشقہ لگایا اور اس کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول چڑھائے۔ اب ناقوس اور اذان میں ہم آہنگی کی کوششیں شروع ہوئیں تسبیح کے دانے رشتۂ زنار میں پروئے جانے لگے۔ زمزم و گنگا کے امتزاج سے ایک نئے چشمۂ زندگی کی تحقیق شروع ہوئی۔ خاک حجاز اور جمنا جل کے خمیر سے خدا کے ایک نئے گھر کی تعمیر سطح خیال سے ابھرنے لگی۔ ہندی رسومات شعائر دین بن گئیں برہمنیت کا فلسفۂ حیات مسلمانوں کے رگ پے میں سرایت کر گیا اور دین حجازی کا "بیباک بیڑا" یوں گنگا کے دہانے میں آکر ڈوب گیا۔ ادھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر یورپ سے الحاد و مادہ پرستی کا بحر مواج اپنی تمام شور انگیزیوں اور طوفان خیزیوں کے ساتھ بپھرتا اُمنڈتا بڑھتا چلا آرہا تھا جس میں کہیں علانیہ نفرت انکار کی کف بر دہاں گرداب کی طغیانیاں تھیں اور کہیں عقل پرستی اور تجدد پسندی کی بظاہر ساکت و خاموش لیکن درحقیقت بڑی بھیانک اور خوفناک روانیاں۔ خدا۔ رسولؐ۔ وحی۔ آخرت۔ غرضیکہ ایمان و ایقان کی ہر متاع عزیز کو خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہی تھیں۔ دینِ فطرت میں تو یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ اس طوفان بلا سے کہیں زیادہ مہیب و مہیج طغیانیوں کا مقابلہ کرسکتا۔ لیکن جن بے بنیاد ریت کی دیواروں سنے دین کے حصن حصین ہونے کا دھوکا دے رکھا تھا ان میں یہ تاب کہاں کہ وہ اس بلا انگیزی کی روک تھام کرسکیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر کہ نوجوان طبقہ ایک ایک کرکے دین سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا چلا گیا۔ اور مذہب پرست طبقہ نے ان کی تکفیر و تفسیق کے فتاویٰ کو ان بڑھتے ہوئے فتنوں کا سر کچلنے کے لئے کافی سمجھ کر اپنی خود فریبی اور عملاً اعتراف شکست کا ثبوت بہم پہنچایا۔ الا ماشاء اللہ۔ مذہب پرست طبقہ میں جو چیز خطرناک طور پر حائل ہوتی تھی اور ہو رہی ہے وہ انکی ماضی پرستی ہے۔ یہ وہ زنجیر ہے جو

انھیں اپنے تصورات کے تنگ دائرہ سے باہر قدم ہی نہیں رکھنے دیتی۔ یہ وہ تاگہ ہے جو اس طائر لاہوتی کے پنجوں میں کچھ اس انداز سے اُلجھا ہے کہ وہ اُسے دین فطرت کی فضا بسیط میں بال کشا ہونے ہی نہیں دیتا۔ اللہ تعالےٰ نے جب دنیا میں اس قوم کو بھیجا کہ جس کے متعلق خود ارشاد فرمایا کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (تم نوع انسانی میں سے بہترین قوم ہو) تو ان کو ہلاکت و تباہی کے عمیق غاروں سے بچانے کے لئے ایک مشعل ہدایت ایک سراج منیر ایک نور مبین عطا فرمایا کہ اس کو وہ اپنے جادۂ حیات میں پیش پیش رکھیں۔ اپنے شاہ راہِ عمل میں خضر طریقت بنائیں اور زندگی کے ہر شعبے میں جو قدم بھی اُٹھائیں اسی کی روشنی میں اُٹھائیں تاکہ وہ راستہ کے پُر خطر او رہیب نشیب فراز سے مامون و مصئون منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ لیکن اس روشنی کو اگر وہ قوم بجائے اپنے آگے رکھنے کے کہ جس سے ان کے سامنے کا راستہ روشن ہوجائے۔ اپنے پیچھے اُٹھا رکھیں تو ظاہر ہے کہ قطع شدہ منزل تو ضرور درخشندہ و تابناک نظر آئے گی۔ لیکن سامنے کا راستہ پہلے سے بھی تاریک ہوجائیگا کہ عام عقل کی دُھندلی سی روشنی میں بھی جس قدر راستہ نظر آتا تھا وہ اب انکے اپنے سائے سے اور ظلمت ناک ہوجائے گا نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ غلط راستے پر چلتے ہیں لیکن اسی میں صراط مستقیم سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ غلط مسلمات غلط معتقدات۔ غلط نظریئے ذہن میں جما رکھتے ہیں اور انھیں دین کا نچوڑ قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی نمازوں کا رُخ قبلہ نما کو دیکھ کر ضرور سیدھا کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے قبلہ نما کی سوئی ہی "ترکستان" کی طرف جھک رہی ہے وہ بزعم خویش اپنے آپ کو خدا اور رسولؐ کا متبع جانتے ہیں حالانکہ انکی اتباع محض انسانوں کی اتباع ہوتی ہے۔ ان اپنے جیسے انسانوں کی اتباع جنکی بر سرِ حق و یقین ہونیکی صرف اتنی ہی سند کافی سمجھی جاتی ہے کہ وہ ان سے سو دو سو برس پیشتر کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ انکی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالو بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا۔ ولو کان آباءھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون۔ ۲/۱۷۰

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو نازل کیا ہے اُس کی اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریق پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو دیکھا ہے۔ اگرچہ ان کے آباؤ اجداد نہ کچھ عقل رکھتے تھے نہ ہدایت۔

ان کو اگر آپ ان کے مروجہ وسائیر و آئین سے۔ جو اُن کے آباؤ اجداد سے نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آرہے ہیں۔ ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہٹنے کی دعوت دینگے تو وہ تڑپ اٹھیں گے کہ اُن کے معتقدات ان سے چھن رہے ہیں۔ اور معتقدات۔ خواہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ انسان کی بڑی متاع عزیز ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس خیال سے بھی لرز اٹھیں گے کہ اگر انھوں نے اپنے مروجہ اعمال و عقائد میں تبدیلی پیدا کرلی تو اس سے یہ سمجھنا پڑیگا۔ کہ ان کے بزرگ غلطی پر تھے۔ اور یہ خیال ان بزرگوں کی تعظیم و تقدس کے سخت خلاف پڑیگا۔ ماضی پرستی اور غلط عقیدت کے یہ وہ بت ہیں جنہیں یہ لوگ اپنے کعبۂ دل میں لئے بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے خلاف ایک حرف سننے کیلئے بھی تیار نہیں ہوتے۔ ایک چیز صریح قرآن کریم کے خلاف ہو۔ لیکن اس کے جواز میں۔ بدبختی سے۔ کسی پیش رو انسان کی سند مل جائے۔ تو وہ اپنے اندر کبھی اتنی ہمت نہیں پائیں گے کہ ہدایت ظاہر ہو جانے پر وہ اس غلط نظریہ کو چھوڑ دیں۔ بلکہ ان کی ساری کوشش اس میں صرف ہو جائیگی کہ کسی طرح قرآن کریم کو توڑ مروڑ کر اس کو غلط قالب میں ڈھال لیا جائے۔ اور اگر وہ اپنی اس سعیٔ لا حاصل میں بھی ناکام رہیں تو پھر یہ کہہ کر دل کو بہلا لیا جاتا ہے کہ ان پہلے لوگوں کے سامنے بھی تو قرآن تھا ہی۔ ہم ان کے علم و بصیرت کی بلندیوں تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ یہ جو قرآن کریم اور ان کے مسلک میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ ہماری ہی کوتاہ فہمی کی وجہ سے ہے۔

پھر ماضی پرستی کی بنا پر ایک اور خطرناک عقیدہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم جیسی ہمیشہ زندہ رہنے والی کتاب کو ایک خاص ماحول کا پابند کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ فطرت کی کوئی شے کسی

خاص زمانہ اور زمانہ کے خاص احوال وظروف میں مقید ہو کر نہیں رہ سکتی۔ قرآن کریم خدا کا آخری پیغام ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ قیامت تک کے لئے حیات انسانی سے متعلق جس قدر مسائل پیدا ہوتے جائیں گے اُن سب کا حل اس کے اندر ملیگا۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں جا کر کبھی یہ کہدے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن کریم بھی کبھی یہ نہیں کہیگا کہ بس اب میں تھک گیا۔ جو کچھ میرے اندر تھا سب باہر آچکا۔ اب میں خالی برتن ہوں اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو۔ قطعاً نہیں۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ انسان اپنے عہد طفولیت میں اتنا ہی جانتا تھا کہ اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے۔ لیکن پانی کے اندر جس قدر خصوصیتیں چھپی ہوئی تھیں زمانہ کی عقل وعلم اور تجربہ اور مشاہدہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں گویا وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج اسی پانی سے کس قدر کام لئے جاتے ہیں۔ اور کیا اس پر بھی دنیا آج یہ کہہ سکتی ہے کہ پانی کے اندر جتنی خصوصیتیں پوشیدہ ہیں سب معلوم کرلی گئی ہیں۔ دنیا اپنے تجربات کی جن بلندیوں تک چاہے اُڑتی چلی جائے۔ اشیائے فطرت اس کا برابر ساتھ دیتی جائینگی۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے۔ اس لئے اس سے بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم کسی خاص ماحول میں مقید نہیں ہو سکتا اور کوئی زمانہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن کریم جتنا کچھ بھی جانا تھا سب ان کے عہد میں سمجھا جا چکا۔ قرآن کریم بڑھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے نمل کیا گیا ہے۔ زمانہ علم وعقل کی جن بلندیوں تک چاہے اُڑ کر چلا جائے قرآن کریم وہاں سے بھی دس قدم آگے ہی آگے نظر آئیگا۔ جو بات آج سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کل کی آنے والی نسلیں اگر تجربات ومشاہدات میں ان سے آگے ہونگی۔ خودبخود سمجھ جائیں گی۔ اور اس طرح قرآن کریم کی ایک ایک بات حقیقت ثابتہ بنکر سامنے آجائیگی۔ برعکس اس کے قرآن کریم کو کسی خاص ماحول میں مقید کر دیجئے اور یہ سمجھ لیجئے کہ جیسا کچھ یہ سمجھا جا چکا ہے۔ اس سے زیادہ۔ یا اس کے خلاف۔ بعد کے زمانہ میں یہ سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ تو پھر آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ اسے قیامت تک ساتھ دینے والی کتاب کس طرح تسلیم کیا جائیگا۔ اور آپ کا یہ دعوےٰ۔ جو ایمان کی حقیقت اختیار کئے ہوئے۔

ہے۔ کس بنا پر ثابت ہوگا لیکن تعجب ہے کہ کتاب الٰہی کو صحیفۂ فطرت ماننے والے اس کے متعلق یہ یقین کئے بیٹھے ہیں کہ ازمنہ گذشتہ میں جو کچھ اس سے حاصل کیا جا چکا ہے وہ آخری باب ہے۔ اور اس کے بعد یہ کتاب (نعوذ باللہ) ایک بے کار شئے بن چکی ہے۔ اگر عصر حاضرہ کے انسان اس سے درس عبرت و موعظت لینا چاہیں۔ اپنی بڑھتی ہوئی مشکلات کا حل دریافت کرنا چاہیں۔ تو جب تک وہ اپنے آپ کو ہزار پانچ سو سال پیچھے نہ لے جائیں وہ اس سے مستفیض نہیں ہوسکتے۔ اس نظریئے کے ماتحت قرآن کریم میں تفکر و تدبر کا دروازہ بالکل بند ہوجاتا ہے۔ اور ذہن انسانی رفتہ رفتہ جمود و تعطل کی برودت سے مفلوج اور شل ہوکر رہ جاتا ہے۔

لیکن قرآن کریم میں تدبر کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ اسے انسان اپنے ہی ذہن کے تابع رکھ سکے۔ یعنی اپنے ذہن میں پہلے سے ہی کچھ خیالات راسخ کرلے۔ اور پھر قرآن کریم کو ان کے قالب میں ڈھالنا شروع کردے۔ یہ تو اتنا بڑا کھلا ہوا شرک ہے جس کی کبھی معافی نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم کے حقائق محکم اور راٹل ہیں۔ وہ کسی انسان کے امیال وعواطف۔ کسی کے رجحانات و جذبات کے ماتحت نہیں ہوسکتے۔ مومن وہ ہے جو اپنے تمام رجحانات قلبی و ذہنی کو خدا کی اس مقدس کتاب کے تابع رکھے۔

تو اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن کریم کسی گذشتہ زمانہ کے ساتھ بھی مقید نہیں کیا جاسکتا۔ اور کوئی شخص اسے اپنے خیالات کے تابع رکھ کر کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ تو پھر قرآن کریم کو سمجھا کیسے جائے؟ یہ تھا وہ سوال جو میرے سامنے بار بار اس طبقہ کی طرف سے آتا رہا جس طبقہ میں میں قرآن کریم کے متعلق کچھ جذبۂ اشتیاق پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا تھا۔ قرآن کریم کی رو سے اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ اپنی تفسیر ہے وہ اس تفسیر میں کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں۔ اس کی ہر بات خود اسی سے سمجھ میں آسکتی ہے حضرات بزرگان کرام علیہ الرحمۃ کے علمی کارنامے ہمارے لئے باعث صد افتخار رہیں۔ ان سے

ہم بہت سا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور کیوں نہ اٹھائیں جب کہ ہم اُس کے جائز وارث ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے سمجھنے کا تو ایک ہی طریقہ ہے جو خود قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے۔

لیکن سوال کرنے والا اس کا جواب ان چند الفاظ میں نہیں مانگتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے بتاؤ کہ میں قرآن کریم کو کس طرح سمجھوں! اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم کو پڑھو۔ پڑھنے سے ہی یہ سمجھ میں آجائیگا۔ لیکن جب مجھ سے یہ کہا جاتا کہ میں تو قرآن کریم کو اکثر پڑھتا ہوں لیکن نہ صرف یہ کہ وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ بلکہ اس کے اندر مجھے کوئی لذت اور جاذبیت محسوس نہیں ہوتی۔ تو (بعض) اس سوال کے جواب میں صرف ایک حقارت آمیز "لاحول" کو ہی کافی نہ سمجھتا۔ اس لئے کہ ایسا جواب دینے والوں میں اکثر وہ حضرات تھے جن کی پاکیزگیٔ ایمان۔ جن کی سعادت روح اور جن کے جذبۂ دینی میں مجھے کبھی شبہ نہ ہوتا تھا۔ میں نے اس سوال کو بار بار اپنے دل میں دھرایا۔ اور سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ کونسی دقت ہے جو قرآن فہمی کی بابت ان کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ میں نے مدتوں اس پر غور کیا۔ اللہ سے دعائیں مانگیں۔ اہل نظر حضرات سے مشورے کئے۔ مستفسرین کی مشکلات کا تجزیہ کیا۔ اور اللہ کا احسان ہے کہ اس نے بالآخر میرے سامنے اس پیچیدہ مسئلہ کو واضح کر دیا جس نے ایک مدت تک میرے دل کو بیقرار رکھا تھا۔ وھذا من فضل ربی۔

---

قرآن کریم کے مضامین جس انداز و طریق سے رکھے گئے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ اس جیسی یا اس سے بہتر ترتیب انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہے لیکن قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک مضمون کو مسلسل ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ ایک جگہ ایک حکم ہے دوسری جگہ اس پر کچھ اضافہ ہے کہیں استثنا ہے کہیں اجمال ہے کہیں اس اجمال کی تفصیل ہے اس لئے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ جب اسکا ایک مسئلہ سامنے آئے تو

بیک وقت وہ تمام مقامات بھی نگاہوں کے سامنے آجائیں جن میں مسئلہ زیر نظر سے متعلق مزید باتیں مذکور ہوں۔ جب قرآن کریم سے لوگوں کو شغف تھا تو انکو اسپر ایسا عبور حاصل تھا لیکن آج تو یہ حالت ہو کہ نہ صرف مریض کو مرض کا ہی احساس نہیں بلکہ وہ دوا کے نام سے بھی کوسوں بھاگتا ہے لہذا اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے اتنا عبور حاصل کرلیگا ایک اُمید موہوم ہے۔ بنابریں ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کریم کو اس شکل میں پیش کیا جائے کہ اس کے سمجھنے میں تردد و کاوش نہ ہو اور اسکا طریقہ یہی ہو کہ ایک عنوان کو لیکر قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم کو یکجا جمع کیا جائے اور اس میں ایسی ترتیب دیدی جائے کہ وہ مربوط و مسلسل مضمون کی صورت اختیار کرلے۔ یہ چیز ہماری مروجہ تفاسیر سے تو مل ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ تو الحمد سے والناس تک ایک ایک آیت کا الگ الگ مطلب بیان کرتی جاتی ہیں ان سے مختلف آیات کا مطلب تو واضح ہوجاتا ہے لیکن قرآن کریم کی تعلیم سمجھ میں نہیں آتی۔ تبویب القرآن پر بھی کچھ کتابیں ہمارے ہاں موجود ہیں لیکن جو کچھ میں چاہتا تھا وہ مطلب ان سے بھی حاصل نہ ہوسکتا تھا ان میں بالعموم الفاظ قرآن کی رو سے آیات کو مختلف ابواب میں تقسیم کرکے ایک جگہ جمع کردیا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں ایک ہی لفظ کئی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ الفاظ کی رعایت سے تبویب آیات ڈھونڈھنے میں تو ممد ہوسکتی ہے لیکن مطالب کے سمجھنے میں مفید نہیں ہوسکتی قرآن کریم کی تعلیم کو اس نہج سے مرتب کرنا کچھ آسان کام نہ تھا ایسے ایسے کام درحقیقت جماعتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں کے موجودہ تشتت و افتراق کے دور میں جبکہ جماعتی نظام کا مقصد ہی نگاہوں سے اوجھل ہوچکا ہو۔ یہ خیال کہ کوئی جماعت اس کام کے لئے آمادہ عمل ہوجائیگی خوش فہمی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جو نقشہ میرے ذہن میں تھا اسکے مطابق میں نے دو تین عنوانوں کو تجربۃً لیا ابتدا میں دقت تو ضرور ہوئی لیکن جب اس کے نتائج میرے سامنے آئے تو میری نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ اب سمجھ میں آیا کہ قرآن کریم کا یہ

دعویٰ کسقدر صحیح ہے کہ یہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس تفسیر میں اور اُس تفسیر میں جو ذہن انسانی کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ کتنا فرق ہے۔ ایک طرف اہلِ طلب کا تقاضا کہ ہمیں بتاؤ کہ قرآن کریم کو کسطرح سمجھیں دوسری طرف اس نہج قرآن کریم کو سمجھنے کے دیکھنے مجھ ہمیں ہے خیال کو یقین راسخ کی حد تک لے گئے کہ یہ کام کرنیکا ہے۔ کام کی عظمت اور اپنی کمزوریاں ڈراتی تھیں لیکن وقت کی ضرورت اور نتائج کی اہمیت مجبور کرتی تھیں کچھ وقت اسی کشمکش میں رہا بالآخر تائیدِ غیبی نے مجھے اس حوصلہ آزما عظیم المرتبت مہم کے لئے آمادہ کر دیا اور اس کے بعد میں نے اس فریضۂ مقدس کو مقصدِ حیات قرار دیکر اپنی فرصت کا ایک ایک لمحہ اس "جنون" کی نذر کر دیا۔ پہلا مرحلہ قرآن کریم کے بہت سے مفردات کے حتی الامکان قرآن کریم سے معانی متعین کرنا تھا اِسکے بعد اصل کام شروع ہوا پہلے تو سیکڑوں ابواب تجویز کیئے گئے اور ہر باب کے تحت سیکڑوں عنوانات قائم ہوئے پھر ہر عنوان کے ماتحت معنوی اعتبار سے قرآن کریم کی آیات کو یکجا جمع کیا گیا اس کے بعد تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہوا اور ہر عنوان کے ماتحت جمع شدہ آیات میں ایک ربط و نظم قائم کر کے تمام تعلیم کو ایک مسلسل اور مربوط مضمون کی شکل میں ترتیب دینا شروع کیا۔ یہ تیسرا دور اسوقت تک بہت سا ختم ہو چکا ہے اور ابھی بہت سا باقی ہے لیکن یوں سمجھئے کہ اس سے قرآن کریم کا ایک ایسا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) مرتب ہو گیا کہ ذہن انسانی میں کوئی خیال آئے۔ اِسکے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ ہے سب بیک وقت ایک مسلسل اور دلکش مضمون کی صورت میں آپکے سامنے ہوگا جسمیں کسی انسانی خیال کو کچھ دخل نہ ہوگا کیونکہ ربطِ عبارت کے سوا کچھ اپنی طرف سے نہیں بڑھایا گیا۔ جہاں جہاں کسی توضیحی یا تمہیدی عبارت کی ضرورت پڑی ہے وہ بھی دراصل اِن آیات کا ہی ترجمہ ہے جو اس مقام پر سیاق و سباق میں درج ہیں۔ کامل دس برس کی شبانہ روز محنت سے میں اتنا کچھ کر سکا ہوں، اندازہ یہ ہے کہ یہ مکمل انسائیکلوپیڈیا پانچ چھ مجلدات میں آجائے گا۔ جتنی منزل قطع ہو چکی ہے آج میں جب نگہ بازگشت سے اسے دیکھتا ہوں تو حیران رہجاتا ہوں

کہ یا اللہ! یہ منزل میں نے کیسطرح طے کرلی! حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی توفیق اور اسکا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو میں شاید کئی "عمروں" میں بھی اتنا کچھ نہ کر سکتا۔

---

اسی دوران میں یہ چیز بھی سمجھ میں آئی کہ قرآن کریم کی تفسیر کسی ایک فرد واحد کا کام نہیں، اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم ایک دستورِ حیات ہے نظام زندگی کا مکمل ضابطہ ہے تاریخ اور جغرافیہ فلسفہ اور ہیئت۔ طبیعات اور حیاتیات۔ فلکیات اور طبقات الارض وغیرہ علوم و فنون کی کتاب نہیں لیکن چونکہ یہ اسکی کتاب ہے جسکا علم دنیا کے تمام علوم کو احاطہ کئے ہوئے ہے اس لئے قرآن کریم میں ضمناً اور کنایتاً (یعنی) جہاں کہیں دنیاوی علوم کے متعلق کوئی اشارہ آگیا ہے اس اجمالی اشارہ میں ان علوم کی اصولی تفصیلات سمٹ کر در کوزہ ہوگئی ہیں اس اعتبار سے یہ پیغام خداوندی جو اولاً اور اصولاً حیاتِ انسانی کی ہدایت کا ہی ایک ضابطہ ہے مختلف علوم و فنون کی جامع کتاب بھی بن گیا ہے مثلاً وجود باری تعالیٰ یا حیات بعد الممات کے دلائل میں تخلیق ارض و سمٰوٰت کا ذکر آگیا ہے تو ہر چند یہ ذکر ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے لیکن ہو نہیں سکتا کہ سائنس کے اکتشافات تخلیق ارضی و سما کے متعلق اپنی تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچیں وہ اس سے مختلف ہو جو قرآن کریم میں ضمناً تشبیہاً مذکور ہے اگر اختلاف ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہنوز سائنس کی تحقیق یقین کے مرتبہ تک نہیں پہنچی قیاس و ظن کی حدود کے اندر ہے اس سے آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ قرآن کریم کے ان گوشوں کی تفسیر کسی ایک شخص کا کام نہیں ہو سکتا۔ تفسیر بالقرآن کی رو سے ان مقامات کے معانی تو متعین ہو جاتے ہیں لیکن ان معانی کی تفصیلات اور جزئیات کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس خاص فن کا ماہر (SPECIALIST) ہو۔ اور جو بتا سکے کہ ذہنِ انسانی نے اس وقت تک اس خاص فن کے متعلق کیا معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اور قرآن کریم ہمیں کہاں تک لے جاتا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں۔ جہاں ہر مقام کے لئے ایک ایک ماہرِ فن کی ضرورت ہے۔ جو قرآن کریم

کی روشنی میں ان علوم کی ریسرچ کریں اور اپنے نتائج سے قرآن کریم کی تفسیر بیان کریں بعض اہل ذوق حضرات نے اس قسم کی کوششیں کی بھی ہیں اور اُن کے نتائج بڑے بصیرت افروز ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ کام بھی افراد کا نہیں۔ انفرادی کوششوں کا نہیں یہ تو حکومت و سلطنت کا کام ہے۔ نظام جماعتی کا کام ہے۔ ماہرین فنون کی جماعتیں قرآن کریم کی ایک ایک آیت کو لیکر اس پر عمریں صرف کر دیں۔ اور مرتے وقت اپنی مساعی جمیلہ کا ماحصل آنے والوں کے سپرد کر جائیں۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم کی ایک ایک متشابہ آیت محکمات کی ذیل میں چلی آئے اور انسان علیٰ وجہ البصیرت پکار اُٹھے کہ انہٗ الحق۔ حقیقت صرف قرآن کے اندر ہے۔ باقی سب ظن و قیاس ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ایک انسان ان مخصوص فنی امور (TECHNICAL SUBJECTS) کا عالم نہیں ہو سکتا اس لئے وہ ان مختلف شعبہ ہائے علوم (BRANCHES OF SCIENCE) سے متعلقہ آیات قرآنی کی تفسیر کیسے بیان کر سکے گا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکا ہوں کہ ان خاص علوم کے مبادیات کو کہیں کہیں بیان کر دیا ہے۔ تاکہ ایک اجمالی سا تصور ذہن میں مرتسم ہو سکے کہ قرآن کریم اس مقام پر کسی خاص شعبۂ علم کے اصول بیان کر رہا ہے۔ جزئی تفسیر نہ میرے بس کی بات ہے۔ نہ مجھے اس کا دعویٰ ہے۔ البتہ قرآن کریم کا باقی وہ تمام حصہ جو نفس انسانی کی ہدایت سے متعلق ہے۔ جو ضابطۂ حیات ہے۔ جو نظام اجتماعی کا دستور اساسی ہے۔ اس کی کھلی کھلی اور واضح تفسیر خود قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اور وہی تفسیر آپ کو اس کتاب۔ معارف القرآن کے اندر مل جائیگی۔ اس باب میں انشاء اللہ آپ کو قرآن کریم کی صحیح صحیح تعلیم کے سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوگی۔ میں نے اس ضمن میں اس چیز کی بھی رعایت رکھی ہے کہ آج کل ہمارے نوجوان "مذہب گزیدہ" طبقہ کے دلوں میں جس قسم کے شکوک و شبہات عام طور پر پیدا ہوتے ہیں ان کا ازالہ بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا جائے اس غرض کے لئے مجھے وہ توضیحی اور تمہیدی عبارات بڑھانی پڑی ہیں جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب عام طور پر حروف تہجی کی رو سے کی جاتی ہے۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ اس کتاب کی ترتیب میں بھی یہی اصول پیش نظر رکھا جائے۔ لیکن بہت سے صائب الرائے حضرات نے بوجوہ چند اس کی مخالفت کی اور بالآخر یہی قرار پایا کہ اسے اس انداز سے ترتیب دیا جائے کہ جہاں ہر عنوان فی ذاتہ مکمل اور مربوط ہو۔ وہاں وہ ایک سلسلۂ دراز کی کڑی بھی ہو۔ یعنی ان عنوانوں کے باہمد گر ملنے سے جو ایک کتاب مرتب ہو۔ وہ بجائے خویش مربوط و مسلسل ہو۔ لہٰذا اس کی ترتیب کی یہ بنیاد رکھی گئی ہے کہ اللہ۔ ملائکہ۔ رسالت۔ کتاب۔ کائنات۔ آخرت سے متعلق ابواب کو اسی ترتیب سے مسلسل رکھا جائے۔ یہ پانچ چھ عنوانات یوں تو پانچ چھ الفاظ ہیں لیکن یوں سمجھئے کہ ہر عنوان ایک ضخیم جلد کا نام ہے۔ ایمانیات۔ اخلاقیات معاشرت بمعیشت۔ تمدن۔ عمرانیت۔ اقتصادیات۔ نفسیات۔ نظام اجتماعی۔ مرکزیت۔ مبداء و معاد۔ مختلف علوم و فنون۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ اثری تحقیقات۔ علم الارض۔ فلکیات شعائر و مناسک۔ عبادات و رسومات۔ اسلامی حکومت۔ بین الاقوامی قوانین دساتیر۔ غرضیکہ علم و عمل کے متعلق کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس سے متعلق قرآن کریم کی تعلیم اس کتاب کے اندر نہ آگئی ہو اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت بیسیوں عنوانات کے ماتحت آگئی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ ہر عنوان سے پہلے ایک فہرست مشمولات دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی آیات قرآنی کی بھی ایک الگ فہرست دی گئی ہے۔ ایک جلد کے خاتمہ پر اس جلد سے متعلق تمام مباحث کی ایک مکمل فہرست۔ حروف تہجی کے ماتحت بطور (INDEX) شامل کر دی جائیگی۔ اور ساری کتاب کے مکمل ہونے پر ایک مفصل و مبسوط فہرست۔ حروف تہجی کے لحاظ سے اس انداز سے دی جائیگی کہ ایک ایک مسئلہ کئی ایک حروف کے ماتحت مل سکے۔ اور ڈھونڈھنے میں دقت نہ رہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی تمام آیات کی فہرست بھی دی جائیگی تاکہ معلوم ہو سکے کہ فلاں آیت کس کس جگہ آئی ہے۔ اس طرح گویا تمام قرآن کریم کی تفسیر۔ الحمد سے والناس تک آیات کی ترتیب سے بھی سامنے آجائیگی۔ یہ واضح رہے

کہ ایک عنوان کے ماتحت جہاں مختلف امور کا ذکر ہوگا۔ ان امور سے متعلق مفصل بحث اس خاص عنوان کے ماتحت ہی ملیگی۔ مثلاً تخلیق ارض و سما کے عنوان میں اگر ارتقائی منازل کا ذکر آگیا ہے۔ تو اس کی تفصیلی بحث نظریہ ارتقاء کے عنوان میں ملیگی۔ وقس علی ھٰذا۔ قرآن کریم کی آیات کا متن بھی دیا گیا ہے۔ اور ترجمہ بھی۔ ترجمہ اگرچہ رواں رکھا گیا ہے لیکن اصل سے اختلاف نہیں پیدا ہونے دیا۔ شاہ عبد القادر۔ شاہ رفیع الدین علیہ الرحمۃ۔ اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے تراجم سے بالعموم استفادہ کیا گیا ہے۔ ہر آیت کا شمار اس طرح دیا گیا ہے کہ اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً ۲/۷ سے یہ مطلب ہے کہ سورۂ بقر کی ساتویں آیت ہے۔

---

لیکن یہ سب کچھ انسانی دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو کسی صورت میں بھی سہو و خطا سے منزہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کے متعلق ایک لفظ لکھتے وقت بھی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ ہاتھ تھرتھرا جاتا ہے کہ یہ ذمہ داری بڑی عظیم الشان اور یہ مرحلہ نہایت نازک ہے۔ باین ہمہ احتیاط و احساس نہ مجھے اس امر کا دعویٰ ہوسکتا ہے۔ اور نہ کسی انسان کو۔ کہ جو کچھ سمجھا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں اصلاح کی گنجایش نہیں۔ اپنی طرف سے کوشش کی گئی ہے۔ اور بڑی احتیاط سے کوشش کی گئی ہے۔ کہ قرآن کریم کو خود قرآن ہی سے سمجھا جائے۔ اور اس طرح جس نتیجہ پر قرآن کریم پہنچائے اسے بلا کم و کاست۔ بلا خوف و خطر درج کر دیا جائے۔ اس میں نہ اپنے خیالات کو کچھ دخل ہو نہ ان غلط معتقدات کو جو مرور زمانہ سے "مسلمات" کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسا کرنے میں مجھے خود کئی ایک اپنے خیالات کو بدلنا پڑا جنہیں میں اس سے پیشتر اسلامی نظریات سمجھے بیٹھا تھا۔ لیکن قرآن کریم کے سمجھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ غیر قرآنی تھے اور ان کے اسلامی ہونے کی سند یہی تھی کہ وہ ایک عرصہ دراز سے مسلمانوں میں رواج پذیر ہو چکے تھے۔ یہ اختلافی گوشے بڑی کٹھن منزلیں

تھیں - ماحول کا اثر - وراثتی رجحانات - ابتدائی تعلیم کے نقوش - بچپن سے کان میں پڑی ہوئی آوازوں کے تاثرات - قدیمی روایات - یہ تمام قوتیں ایک طرف اور قرآن کریم کے فیصلے دوسری طرف - ظاہر ہے کہ یہ کشاکش بڑی سخت تھی - یہ کشمکش بڑی نازک تھی - یہاں پہنچکر قدم میں لغزش آجانا کچھ بعید نہ تھا لیکن میری جبین نیاز اس بارگاہ صمدیت کے سنگ آستان پر ہزار بار اظہار تشکر میں سجدہ ریز ہے کہ اُس مقلب القلوب نے اس کمزور و ناتوان کو یہ توفیق عطا فرمادی کہ ان تمام محسوس و غیر محسوس ذہنی و قلبی رجحانات - احوال و ظروف کے اُن تمام امیال و عواطف کو دامن خیال سے جھٹک کر مستانہ وار اس حقیقت کبریٰ کی طرف بڑھ جاؤں جسے قرآن کریم بے نقاب پیش کر رہا ہو-

پھر اس کتاب سے یہ بھی مقصود نہیں کہ قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم مستحاباً اس کے اندر آگئی ہے - اس سعیٔ بلیغ کے باوجود سیکڑوں ابواب اور ہزاروں عنوان ایسے ہوسکتے ہیں جو اس پر اضافہ کئے جاسکتے ہیں - قرآن کریم تو وہ بحر بے کنار ہے کہ کوئی انسانی عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی - میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تو محض ایک خاکہ ہے اس حقیقت کے سمجھانے کا کہ قرآن کریم کی صحیح تعلیم یوں سمجھ میں آسکتی ہے - اور اس کی صحت پر یقین اس لئے ہے کہ یہ میرے یا کسی اور انسانی - دماغ کی اختراع نہیں بلکہ خود قرآن کریم نے ہی یہ طریقہ سمجھایا ہے - دنیا آگے بڑھیگی - اور اس خاکے میں رنگ بھریگی - زمانہ ترقی کریگا اور ان بنیادوں پر حسین و جمیل فلک بوس عمارات تعمیر کریگا - میرا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ وہ سعید روحیں جو قرآن کریم سے تلاش حقائق کی تڑپ رکھتی ہیں - ان کے لئے وہ ابتدائی مشکلات حل کر دوں جو قرآن کریم کے براہ راست سمجھنے میں ان کے راستے میں حائل ہوتی ہیں - اگر میری یہ حقیر سی کوششیں ملت اسلامیہ میں قرآن کریم کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے میں کچھ بھی کامیاب ہوگئیں تو میں سمجھونگا کہ میری کاوشوں کا مجھے کافی صلہ مل گیا - کہ اصلی صلہ تو اُس شاہنشاہ حقیقی کے دربار سے ہی مل سکتا ہے جو نیتوں کا جاننے والا اور ارادوں کا واقف کار ہے - جو مساعی اس کے

ہاں مشکور ہو جائیں وہی نتیجہ خیز ہیں۔ اور جو وہاں نامقبول ہوں۔ وہ خواہ بظاہر کتنی ہی درخشندہ وتابناک ہوں۔ دنیا و آخرت دونوں میں موجب خسران ہیں۔

پھر بعید از سپاس گذاری ہوگا اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ جو استفادہ میں نے حضرات سلف علیہ الرحمہ کی متاع علمی سے کیا ہے۔ میری گردن تسلیم اس کے بار منت سے خم ہے۔ لیکن ان سے بھی زیادہ میرے شکریہ کے مستحق وہ بزرگ ہیں جنکے قیمتی مشورے۔ جو ان کے تبحر علمی۔ بلند نگہی۔ کشادہ ظرفی اور محبت قرآن کے آئینہ دار ہیں۔ بڑے بڑے مشکل مقامات پر میرے لئے خضر راہ بنے۔ پھر سپاس گذار ہوں اُن دوستوں کا جن کی قرآن کریم سے دلچسپی اس طول وطویل سفر میں میری دلجوئی اور حوصلہ افزائی کا موجب بنتی رہی۔ اور جن کے تقاضائے شوق سے یہ کتاب سردست اس شکل میں شائع ہونی شروع ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو تعلقات قرآن کے رشتہ سے وابستہ ہوتے ہیں ان میں خلوص ومحبت کی وہ جنتیں آباد ہوتی ہیں۔ جو دنیا میں کسی اور تعلق سے حاصل نہیں ہوسکتیں اور کوئی کیف وبہار جن کا مقابلہ نہیں کرسکتی ان کیفیات کا اندازہ کچھ وہی رندمشرب کرسکتے ہیں جو اس خمکدہ حجازمیں مشغول نوشانوش ہیں۔

آخر میں دعا ہے کہ یہ حقیر وبے مایہ سی "متاع عزیز" جو اس شاہنشاہ گدا نواز کے آستانہ عالیہ پر جھکی ہوئی نگاہ۔ عرق آلود پیشانی لڑکھڑاتے ہوئے قدم اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اس کے حضور میں شرف باریابی کی تقریب بن جائے۔ نگاہ اُس کی چشم کرم پہ ہے نہ صلہ ومعاوضہ پر۔ کہ سنتا ہوں کہ اس کے بازار رحمت میں داد وستد کے کچھ ایسے ہی انداز ہیں۔

ربنا ولا تحمل علینا اصرا

ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا۔ ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولٰنا فانصرنا علی القوم الکافرین ۵ ۲/۲۸۶

Printed at the Jayyed Press, Published by Z. A. K. from Tolue Islam Office.